پانی پر لکھا نام

(منتخب افسانے)

رتن سنگھ

اردو اکادمی دہلی

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے
ہیں مزید اس طرح کی شان دار،
مفید اور نایاب کتب کے حصول کے لئے
ہمارے وٹس ایپ گروپ کو جوائن کریں

ایڈمن پینل

عبداللہ عتیق : 03478848884

سدرہ طاہر : 03340120123

حسنین سیالوی : 03056406067

HaSnain Sialvi

پانی پر لکھا نام

(منتخب افسانے)

Supplied under RRRLF & GNCTD
Matching Scheme 2010-11

رتن سنگھ

اردو اکادمی دہلی

سلسلہ مطبوعات اردو اکادمی دہلی نمبر۔۱۶۱

PANI PER LIKHA NAAM

By

RATTAN SINGH

Pub. by

URDU ACADEMY, DELHI

Print

2008

Rs.100/-

ضابطہ

سنِ اشاعت

۲۰۰۸ء

۱۰۰/روپے

اصیلا آفسیٹ پریس، کلاں محل، دریا گنج، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۲

اردو اکادمی، دہلی، سی۔ پی۔او۔ بلڈنگ، کشمیری گیٹ، دہلی۔ ۱۱۰۰۰۶

ISBN: 81-7121-164-X

HaSnain Sialvi

ترتیب

○ حرفِ آغاز ---------- عکسِ نیرِ بی ---------- 5
○ پیش لفظ (رتن سنگھ کی سنگت میں) ---------- وائس چیئرمین ---------- 7
• پانی پر لکھا نام ---------- 11
• ایک ناؤ کے سوار ---------- 16
• مداوا ---------- 22
• آخری سطر ---------- 26
• اُجڑا ہوا ٹیلہ ---------- 30
• دُکھ کے سُکھ ---------- 38
• ایک ہے بوڑھا ---------- 41
• اصل غلطی ---------- 47
• موت کا ڈر ---------- 50
• تم تو جانتے ہو ---------- 54
• سوالیہ نشان ---------- 60
• خطرہ ---------- 65
• روداد پاگل خانے کی ---------- 70
• بندھن ---------- 83
• آف سیزن ---------- 88
• گھاس کے پھول ---------- 92

HaSnain Sialvi

- دِل دریا ---------- 101
- سوکھے پتّے ---------- 105
- سہاگ رات ---------- 110
- ایک بُت پتھر کا ---------- 116
- بہاؤ ---------- 123
- رُوپ نگر کی گوری ---------- 128
- یقین نہیں آتا ---------- 132
- امانت کی چابیاں ---------- 137
- سب سے اچھا دوست ---------- 144
- بہانہ ---------- 148
- ہزاروں خواہشیں ایسی ---------- 151
- ایک ضروری کام ---------- 157
- زندگی کے رنگ ---------- 162
- خبر، حقیقت اور افسانہ ---------- 168
- سون چڑی ---------- 174
- ندی پیاسی ہے ---------- 180
- اپنی کہانی ---------- 194

○○○

HaSnain Sialvi

حرفِ آغاز

دلّی ہمیشہ ہندوستان کے دل کی دھڑکنوں کا محور و مرکز رہی ہے۔ اسی لیے ''عالم میں انتخاب'' اس شہر بے نظیر کی تاریخ و تہذیب، علم و فن اور زبان و ادب کو پورے ملک کی نمائندگی کا شرف حاصل ہے۔ آزاد ہندوستان کی یہ تاریخی راجدھانی بجا طور پر اردو زبان و ادب کی راجدھانی بھی کہی جا سکتی ہے۔ اسی کے گرد و نواح میں کھڑی بولی کے بطن سے زبانِ دہلوی یا اردو نے جنم لیا جو اپنی دھرتی کی سیاسی، سماجی، تہذیبی اور معاشرتی ضرورتوں کے زیر سایہ نشو و نما پا کر اس عظیم تہذیب کی ترجمان بن گئی جسے ہم گنگا جمنی تہذیب کا نام دیتے ہیں اور جو ہماری زندہ و تابندہ تاریخی وراثت ہے۔

دلّی کے ساتھ اردو زبان اور اردو ثقافت کے اسی قدیم اور اٹوٹ رشتے کے پیش نظر ۱۹۸۱ء میں دہلی اردو اکادمی کا قیام عمل میں آیا اور ایک چھوٹے سے دفتر سے اکادمی نے اپنی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ آج دہلی اردو اکادمی کا شمار اردو کے فعّال ترین اداروں میں ہوتا ہے۔ اردو زبان و ادب اور اردو ثقافت کو فروغ دینے کے لیے اکادمی مسلسل جو کوششیں کر رہی ہے، انھیں نہ صرف دہلی بلکہ پورے ملک نیز بیرونی ممالک کے اردو حلقوں میں بھی کافی سراہا گیا ہے۔

اکادمی کے دستور العمل کی رو سے دہلی کے لیفٹننٹ گورنر پہلے اکادمی کے چیئرمین ہوتے تھے، دہلی میں منتخب حکومت کے قیام کے بعد اکادمی کے چیئرمین دہلی کے وزیر اعلیٰ ہو گئے ہیں جو دو سال کے لیے اکادمی کے اراکین کو نامزد کرتے ہیں۔ اراکین کا انتخاب دہلی کے ممتاز ادیبوں، شاعروں، صحافیوں اور اساتذہ میں سے کیا جاتا ہے جن کے مشوروں کی روشنی میں چیئرمین کی منظوری سے اکادمی مختلف کاموں کے منصوبے بناتی

اور انھیں روبہ عمل لاتی ہے۔ اکادمی اپنی سرگرمیوں میں دہلی اور بیرونِ دہلی کے دیگر اردو اداروں سے بھی باہمی مشورت اور تعاون قائم رکھتی ہے۔

اردو اکادمی، دہلی اپنی جن گوناگوں سرگرمیوں کی وجہ سے پورے ملک میں اپنی واضح پہچان قائم کرچکی ہے، ان میں ایک اہم سرگرمی اکادمی کی طرف سے ایک معیاری ادبی رسالے ماہنامہ ''ایوانِ اردو'' اور ''بچوں کا ماہنامہ امنگ'' کی اشاعت کے ساتھ ساتھ اعلیٰ معیار کی علمی اور ادبی کتابوں کی اشاعت بھی ہے۔

جناب رتن سنگھ کا شمار اردو کے اُن چند باکمال افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جو ہمارے افسانوی ادب میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں اُنھوں نے اردو افسانے کو فن کی اُن بلندیوں تک پہنچایا ہے جو کسی بھی زبان کے لیے سرمایۂ افتخار ہوسکتا ہے۔ وہ ایک بڑے تخلیق کار کے فرائض سے کبھی غافل نہیں رہے اُنھوں نے نئی پیڑھی کے ادیبوں کی بھی دل کھول کر حوصلہ افزائی کی ہے۔ اُنھیں فن کے رموز اور تخلیقی اظہار میں زبان کے اُتار چڑھاؤ برتنے کا پورا سلیقہ آتا ہے۔ جناب رتن سنگھ کے ۳۳ افسانوں کا یہ انتخاب پڑھ کر اُن کے اندازِ فکر اور موضوعات کے انتخاب کے بارے میں مکمل آگاہی ہوگی۔ اکادمی جناب رتن سنگھ کی شکرگزار ہے کہ اُنھوں نے بڑی محنت اور جاں فشانی سے ان افسانوں کا انتخاب کرکے اکادمی کو شائع کرنے کی اجازت دی۔

ہم اردو اکادمی دہلی کی چیئرپرسن محترمہ شیلا دکشت کے ممنون ہیں جن کی سرپرستی اکادمی کی کارکردگی میں معاون ہوتی ہے۔ اکادمی کے دیگر ممبران کے سرگرم تعاون اور مفید مشورے ہمارے لیے رہنمائی کا کام کرتے ہیں جس کا اعتراف ضروری ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ زیرِ نظر افسانوی مجموعہ وقت کی ایک اہم ضرورت پوری کرنے کے ساتھ ساتھ عام قارئین کی دلچسپی کا باعث بھی ہوگی۔

مرغوب حیدر عابدی
سکریٹری

HaSnain Sialvi

پیش لفظ

(رتن سنگھ کی سنگت میں)

ترقی یافتہ زبانوں کی علمی اکادمیوں کا مقصد و مدعا اُس کی تخلیقی اور علمی سرگرمیوں کو اس سطح مرتفع سے آگے، نئی بلندیوں کی سمت لے جانا ہوتا ہے، جہاں تک وہ پہنچ چکی ہوتی ہیں۔ اگر ان ادبی سرگرمیوں میں جمود و تعطل کے آثار پیدا ہوتے نظر آئیں تو اُن کے اسباب کو سمجھنا اور تعطل کا مداوا بھی ڈھونڈنا ہوتا ہے۔ یہ خاصہ مشکل کام ہے۔ اس کے پہلو بہ پہلو اکادمی کی بڑی ذمہ داری یہ بھی ہوتی ہے کہ جن قلم کاروں کی لگن، ایثار اور کاوشوں سے اس زبان کا ادب انجانی چوٹیوں تک پہنچا ہے ان کی خدمات کا کماحقہٗ اعتراف کیا جائے۔ ان کو مناسب احترام اور اعزاز دیا جائے۔ ان کے تخلیقی فن پاروں کو نئی پیڑھی کے قلم کاروں سے اس طرح متعارف کرایا جائے کہ ان کے فنی اسلوب کے بنیادی عناصر اُجاگر ہو سکیں۔ دہلی اردو اکادمی اپنے وسائل کی حدوں میں یہ فرائض انجام دینے کی سعی کرتی رہی ہے۔ ہر چند کہ اُردو زبان کے مسائل دوسری قومی زبانوں سے مختلف ہیں۔ وہ بڑی آزمائشوں سے گزرتی رہی ہے۔ اپنے اور بیگانے دونوں ہی اس سے برگشتہ ہیں۔ نتیجہ میں اس کے قلم کاروں کے تخلیقی جوہر اور جوش میں بھی وہ گرمی نظر نہیں آتی جو ہونی چاہیے تھی۔ اس صورت حال میں شاید ہم پر اپنے اُن بزرگ اور اکابر تخلیق کاروں کی قدر شناسی کی ذمہ داری بڑھ جاتی ہے جو ہماری خوش نصیبی سے نہ صرف ہمارے عہد میں زندہ ہیں بلکہ اپنی نو بہ نو تصانیف سے، اپنی تخلیقی توانائیوں سے عصری ادب کو سیراب کر کے، ہماری تہذیب کو توانگر اور تابناک بنا رہے ہیں۔

اُردو اکادمی دہلی، اپنی حدوں میں، آہستہ آہستہ ادیبوں کو ذی وقار مہمان بنانے، اُن کے ساتھ شام منانے اور مختلف طرح کے انعام واعزاز سے نوازنے کے علاوہ استثنائی طور پر اپنے بزرگ اور عبقری ادیبوں کی نئی تصانیف بھی اہتمام سے شائع کرتی رہی ہے۔ ان میں ڈاکٹر محمد حسن اور جوگیندر پال شامل ہیں اور اب رتن سنگھ کی نئی کہانیوں کا یہ مجموعہ اُردو قارئین کو ایک سوغات کے طور پر پیش کیا جارہا ہے۔ یہ تینوں نامور ادیب عمر کی اسّی بہاروں کی رنگارنگ سہانی خوشبوؤں سے گزر چکے ہیں۔ ڈاکٹر محمد حسن ایک ممتاز عالم اور معتبر ناقد ہی نہیں، تخلیقی جولانیوں سے بھی بہرہ ور فن کار بھی ہیں۔ ان کے ڈرامے اور ناول قدر اوّل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جوگیندر پال کے تخلیقی کارنامے ہمارے لیے اس لیے بھی فخر و ناز کا باعث ہیں کہ ان کے ان گنت افسانے اور ناول انگریزی، روسی ہندی اور دوسری کئی زبانوں میں ترجمہ ہوکر داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ اور اب ان کے کم وبیش تمام ناول ٹی۔وی سیریل پر آرہے ہیں۔

رتن سنگھ بھی دہلی کے ادیبوں کے اسی ہراول دستے کے شہسوار ہیں۔ وہ اپنی تصنیفی زندگی کی نصف صدی پوری کر رہے ہیں۔ مغربی پنجاب کے ایک گاؤں سے آکر، ہجرت کے عذاب کی مار سہنے والے، رتن سنگھ نے خاصی پختہ عمر میں قلم اُٹھایا۔ چھٹے دہے میں لکھنؤ کی رہائش کے زمانہ میں وہ راقم الحروف کی عمر اور ہم مسلک نوجوانوں کے درمیان رہ کر کہانی لکھنے کی طرف مائل ہوئے اور پھر پیچھے مُڑ کر نہیں دیکھا— وہ ایک سوچتے ہوئے حساس ذہن اور بے حد نازک تخیلی قوت کے مالک تھے اور آج بھی ہیں۔ اُن کے لکھنے کی رفتار سست رہی اس سے زیادہ یہ کہ اپنی تحریروں کو چھپوانے کی ترغیب سے بھی وہ بیگانہ رہے۔ میں ذاتی طور پر ان کے اس رویے کا شاہد رہا ہوں۔ کبھی کوئی فکر انگیز کہانی زبانی سنا دیتے۔ کبھی لکھ کر، کسی خاص جوش کے بغیر، دھیمی لہجہ میں اس طرح سناتے گویا وہ واقعہ یا سانحہ اُن کے کسی کردار پر نہیں خود ان پر گزرا ہے۔ لیکن ہر کہانی میں گردوپیش کی تہذیبی اور معاشرتی کشمکش کے ساتھ آخر آخر کوئی عارفانہ پہلو ضرور نکلتا تھا۔ میں یہاں ان کی کہانیوں سے مثالیں نہیں دوں گا۔ نہ ہی ان کے فن کے رموز کا کوئی تجزیہ پیش کروں گا۔ صرف میرے ذہن میں ان

کی کہانیوں کے نمواور ذائقہ کا جوعمومی تاثر ہے اس کی جانب چند اشارے کروں گا۔

رتن سنگھ کا فنی اسلوب اور اس کے سروکار ہی نہیں، ان کا وژن اور زاویۂ نگاہ بھی معاصرین سے خاصا مختلف ہے اور یہ فطری بات ہے۔ وہ سماجی حقائق کے ادارک کے باوجود، کہانی میں حقائق کو ایک خاص تہذیبی سطح پر ہی دیکھنے دکھانے پر مائل رہتے ہیں۔ لگتا ہے کہ اس عمل میں انھیں ایک خاص تشفی اور خوشی ملتی ہے۔

راجندر سنگھ بیدی کی طرح وہ پنجاب اور اس سرزمین سے وابستہ قدرت اور تہذیب کے ہر مظہر سے والہانہ محبت کرتے ہیں۔ قدرت اکثر ان کی کہانیوں میں ایک دلکش کردار کی صورت میں نمودار ہوتی ہے۔ تقسیم کے بعد اچانک جب ان کا کنبہ راوی کے کنارے بسے ایک گاؤں سے ہجرت کرنے پر مجبور ہوتا ہے تو گھر کے ہر آدمی کو اپنے سامنے ضرورت کی جو چیز دکھائی دیتی ہے اسے اُٹھا کر وہ بھاگتا ہے کہانی کا واحد متکلم کہتا ہے۔

''جب کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو میں گھبرایا ہوا اُس اندھیرے کمرے میں گیا۔ اس کمرے میں بچھے ہوئے پلنگ پر ایک پل کے لیے لیٹا۔ اس کی بو باس کو اپنے اندر رچایا۔ اس کی دیواروں کو اپنے گرد کھڑا کیا۔ اور پھر چھت سمیت اسے اُٹھا کر جلدی جلدی سیڑھیاں اترنے لگا ایک گاؤں کے گھر کی یہ تہذیب جس میں سانس لے کر وہ بڑا ہوا تھا اس کی پناہ گاہ تھی جسے اُٹھا کر، ساتھ لے کر وہ اپنے آپ کو محفوظ محسوس کرتا ہے۔

مجھے یہاں رتن سنگھ کا ایک ناولٹ ''سانسوں کا سنگیت'' یاد آرہا ہے۔ جس کی کچھ قسطیں میں نے ''نیا سفر'' میں شائع کی تھیں۔ یہ ایک اسپتال میں، عالم سکرات میں پڑے ایک مریض کی خود انکشافی ہے۔ یہاں بھی بچپن کی یادوں کا گہوارہ مرکزی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ مریض اپنے اعترافات کے دوران جس طرح کے مکالموں سے گزرتا ہے وہ سہ ابعادی ہیں یعنی انسانی حیوانی اور قدرت کے مظاہر۔ مصنف ان تینوں طاقتوں کو ذی روح اور ناطق بنا کر ناولٹ میں ڈرامائی صورتحال پیدا کر دیتا ہے۔ اس طرح ناولٹ میں تمثیلی اور شاعرانہ منطق حاوی رہتی ہے۔ یہی صورتحال 'ہزاروں سال لمبی رات' جیسی شاہکار کہانیوں میں زیادہ بلیغ علامتی کردار اختیار کر لیتی ہے۔

رتن سنگھ کی کہانیاں اکثر بڑی مدھم افتار اور دھیمی سی نیم روشن فضا میں آگے بڑھتی ہیں۔اُن کے یہاں جو ایکشن ہے، وہ نفسیاتی ہے یعنی ذہنی اور تحت الشعوری۔اُس میں بھی دھیما پن نمایاں رہتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ رتن سنگھ کی کہانیوں میں جو حکیمانہ دانش ہوتی ہے اور بیانیہ کی جمالیات کے جو انوکھے پہلو ابھرتے ہیں، ایک تربیت یافتہ قاری ہی ان کی مناسب داد دے سکتا ہے۔

رتن سنگھ کا ایک مستقل موضوع اور مسئلہ قدرت کے شاداب مظاہر اور جنگلوں سے انسان کی بڑھتی ہوئی دوری ہے۔اس کے پیچھے صرف ماحولیات کی فطری بحالی کا جذبہ نہیں کچھ اور بھی ہے۔جیسے ان کے نزدیک قدرت سے دور ہو کر انسان اپنی فطری معصومیت، انسانی اقدار ہی نہیں انسانی اخوت اور محبت کی پاکیزہ جبلت سے بھی محروم ہوتا جا رہا ہے۔ نتیجہ میں ننگی خواہشات ہوس پرستی اور زرگری کی ترغیبات اسے ایسے بھنور میں ڈھال رہی ہیں کہ انسان کے لیے خود اپنی شناخت مشکل ہو رہی ہے۔

الغرض یہ کہانیاں رتن سنگھ کے فنی کمال کے نقطۂ عروج کو سامنے لاتی ہیں۔ان کی تخلیقی نزاکت اور نرمی سے لطف اندوز ہونے کے لیے ہماری قرات میں بھی ٹھہراؤ اور دھیمے پن کی ضرورت ہے۔

قمر رئیس

وائس چیئرمین

پانی پر لکھا نام

دریا، وقت کے بہاؤ کی طرح متواتر بہتا جا رہا ہے۔

اور میں اس کے پانی پر اپنا نام لکھنے کی بے سود کوشش کر رہا تھا۔ میرے حروف لکھے جانے سے پہلے ہی یوں مٹتے جا رہے تھے جیسے کہتے ہوں اہم اور غیر اہم کام ماضی کا حصّہ بنتے ہی پگڈنڈی پر بننے والے زندگی کے نشانوں کی طرح مسافروں کے منزل پر پہنچنے سے پہلے ہی مٹ جاتے ہیں۔ پتا ہی نہیں چلتا کہ اس راستے پر چلتا ہوا کون بشر گزر گیا۔

لیکن میں تھا کہ بڑی محنت سے بڑے انہماک کے ساتھ یہ کام یوں کر رہا تھا جیسے کوشش کرتے رہنے سے مجھے کبھی نہ کبھی کامیابی مل جائے گی۔ کامیابی مل جائے گی اور میرا نام لہروں کی شکل میں ڈھل کر بہتا ہوا سمندر تک پہنچ جائے گا اور میں سمندر کا حصّہ بن کر سمندر سا بڑا ہو جاؤں گا۔ ایک بحرِ بے کراں۔

پانی پر لکھے جانے والے میرے حروف لکھتے لکھتے ہی بکھر جاتے تھے اور ان سے میرے نام کی تشکیل نہیں ہو پا رہی تھی، لیکن اس پر بھی میری دل شکنی نہیں ہو رہی تھی۔ میری کوشش میں کوئی کمی واقع نہیں ہو پا رہی تھی اور اس کی ایک وجہ غالباً یہ تھی کہ دریا کے بہاؤ کے کنارے جس جگہ پر بیٹھا میں اپنے کام میں مشغول تھا، اس سے تھوڑے ہی فاصلے پر ایک چھوٹا سا بچہ دریا کی گیلی رات سے گھروندہ بنانے میں منہمک تھا۔ میری طرح اسے بھی ناکامی ہی حاصل ہو رہی تھی۔ وہ اپنے پیر پر جمائی ہوئی ریت کے نیچے سے جیسے ہی اپنا پاؤں باہر نکالتا ویسے ہی دریا کا پانی اس کے گھروندے کے نیچے کی ریت کاٹتا اور اس کا گھروندہ ڈھے کر ڈھیری ہو جاتا۔

'ہت تیرے کی۔ پھر ڈھے گیا۔' اس قسم کے الفاظ بہ آواز بلند دو ہراتا ہوا بچہ گھروندے کے ڈھہنے پر ایک نظر گھروندے کی بکھری ہوئی ریت پر ڈالتا۔ پھر ایک نظر میری طرف دیکھتا اور پھر اپنے آپ میں گم دوسرا گھروندہ بنانے کے لیے اپنے پیر پر گیلی ریت جمانا شروع کر دیتا۔

لگتا تھا کہ اسے گھروندے ٹوٹنے میں بھی مزہ آرہا تھا۔ اس لیے نیا گھروندہ بناتے ہوئے اس کے دل میں زیادہ اُمنگ ہوتی تھی اور وہ زیادہ پھرتی سے، زیادہ لگن سے نیا گھروندہ بنانے لگتا تھا۔

بچے کا یہ ساہس میرے اندر بھی اُمید کی کرن پیدا کر رہا تھا۔ میری انگلیوں میں بھی نئی پھرتی بھر جاتی تھی اور میں جلدی جلدی پانی پر اپنا نام تحریر کرنے کی کوشش میں لگ جاتا۔

بچے کے پاس تو کوئی تجربہ نہیں تھا۔ وہ تو نیا نیا زندگی کے کھیل میں وارد ہوا تھا۔ اگر اس کے پاس کچھ تھا تو پریوں کے دیش کا کوئی خوبصورت سا سپنا تھا جسے وہ اس گھروندے کی شکل میں ساکار کرنا چاہتا تھا۔ اپنی زندگی کو خوشیوں سے بھرنا چاہتا تھا۔ لیکن میں..... میں تو زندگی کے آخری پڑاؤ کی مسافت پر پہنچتے پہنچتے زندگی کی ناپائیداری سے اچھی طرح واقف ہو چکا تھا۔ مجھے تو پتہ تھا کہ.....

زندگی کی تمام مٹھاس کڑواہٹ میں بدل جاتی ہے۔

رشتے ٹوٹ جاتے ہیں۔

دوستیاں چھوٹ جاتی ہیں۔

اور یہاں تک ہوتا ہے کہ انسان اپنے آپ سے بھی روٹھ جاتا ہے۔

اس حقیقت سے واقف ہونے کے باوجود میں پانی کی سلیٹ پر اپنا نام لکھنے کی کوشش میں پوری طرح مگن تھا۔ مجھے دل ہی دل میں یہ بھی پتا تھا کہ میری کوشش لاحاصل ہے۔ اس سے کچھ بھی ہونے ہوانے والا نہیں، لیکن پھر بھی میں اپنی کوشش جاری رکھے ہوئے تھا اور اس کی اصل وجہ غالباً یہ ہے کہ یہ جو ہوا ہے نا..... یہ نہ خود چین سے بیٹھتی ہے نہ ہی کسی کو چین سے بیٹھنے دیتی ہے۔ سانس کے ذریعے یہ ہوا جو متواتر ہمارے اندر آتی جاتی رہتی ہے، تو

خون دوڑتا ہے، دل دھڑکتا ہے، نبض چلتی ہے۔ بدن کا رُواں رُواں حرکت میں آجاتا ہے اور پھر انسان ہوا کی طرح چین سے بیٹھ نہیں پاتا۔

میری حالت بھی کچھ ایسی ہی ہو رہی ہے، بلکہ زندگی کے آخری پڑاؤ میں اس ملاح جیسی ہو رہی ہے جس کے ہاتھ کمزور پڑ گئے ہیں، پتوار کہیں گر چکے، اب ناؤ لہروں کے حوالے ہے۔ ہوا جدھر لے جاتی ہے، چلا جاتا ہے، لیکن جینے کی آس نہیں چھوڑتا۔

یہی حالت میری بھی ہے۔ نام لکھا نہیں جاتا۔ پانی کے کاغذ پر حرف بننے سے پہلے ہی بکھر بکھر جاتے ہیں مگر میں، پھر بھی لکھتا جا رہا ہوں۔

میں اپنے کام میں مگن تھا کہ کیا دیکھتا ہوں کہ کسی پیڑ کی ٹہنی پانی میں بہتی ہوئی آ رہی ہے۔ جب وہ ٹہنی میرے قریب سے گزری تو میں نے دیکھا کہ اس ٹہنی سے لگے ہوئے چوڑے چوڑے سے پتے پانی میں جدھر سے گزر رہے تھے اپنے پیچھے ایک لکیر سی چھوڑتے چلے جاتے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ تھوڑی دیر بعد لکیر مٹ جاتی تھی لیکن وہ بنتی ضرور تھی۔ پانی میں بنتی ان لکیروں کو دیکھ کر میرے دل کو ڈھارس سی بندھی اور میں نے سوچا کہ زندگی وقت کے بہاؤ میں جدھر سے گزرتی ہے، اپنے نقش ضرور چھوڑتی ہے۔ ایسا سوچ کر میری انگلیوں میں پھرتی بھر گئی اور میں جلدی جلدی اپنا نام تحریر کرنے لگا۔

اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ وہ ٹہنی جب بچے کے قریب پہنچی تو وہ پانی میں اترا اور ٹہنی کو پکڑ کر باہر لے آیا۔ پہلے تو وہ کچھ دیر ٹہنی کو غور سے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے دو دو تین تین پتوں کو ٹہنی کے ہی تنکوں سے جوڑ کر ایک چوڑا سا پتل بنا لیا۔ پھر اس پتل کو اپنے پاؤں کے نیچے رکھا اور اپنا گھروندہ بنانا شروع کر دیا۔

مجھ سے پانی کی سطح پر اپنا نام لکھا نہیں جا رہا تھا۔ ہر کوشش ناکام ہوتی جا رہی تھی۔ میرے ساتھ ساری عمر یہی ہوتا رہا ہے۔ خوشیوں کے تمام گھروندے پل دو پل میں ریت کے گھروندوں کی طرح کن کن بکھر گئے تھے۔

لیکن اگر یہ لڑکا اپنا گھروندہ بنانے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو میں سمجھوں گا کہ میرا بھی گھروندہ بن گیا۔ میرا نام بھی پانی کی سلیٹ پر تحریر ہو گیا۔ کیا اسے کامیابی ملے گی؟ کچھ کہہ

نہیں سکتا۔ ممکن ہے مل جائے۔ ممکن ہے نہ ملے۔ کامیابی مل بھی سکتی ہے۔ نیا ذہن ہے۔ نئی سوچ ہے۔ آخر اس نے دریا میں اترنے کا حوصلہ پیدا کیا ہے اور ٹہنی کو پانی کی روانی سے چھین کر باہر لایا ہے۔ دریا کی روانی کیا ہے؟ زندگی کے حالات کی روانی اور یہ بچہ ان حالات کو اپنے فن میں ڈھالنے کی کوشش کر رہا ہے۔

''خدا کرے اسے کامیابی ملے'' میں نے سوچا۔

''پرماتما کرے کہ وہ گھروندہ بنالے۔'' میں نے دل کی گہرائیوں سے اسے دُعا دی۔

اور پھر تھوڑی دیر بعد ڈرتے ڈرتے نظریں اُٹھا کر میں بچے کی طرف دیکھنے جا ہی رہا تھا کہ میرے کانوں میں بچے کی تالیوں کی آواز سنائی دی۔

میرا گھروندہ بن گیا۔

میرا گھروندہ بن گیا۔

میں نے دیکھا کہ بچے نے اپنا پاؤں گھروندے سے باہر نکال لیا تھا اور اس کا گھروندہ پتوں کے پتل پر ٹکا اپنی جگہ پر قائم دائم تھا۔ پانی کی لہریں اب بھی گھروندے کے نیچے کی ریت کو بھگو رہی تھیں لیکن پتوں کا پتل بچے کے گھروندے کو کوئی آنچ نہیں آنے دے رہا تھا۔

میں اسی وقت اپنی جگہ سے اُٹھا اور بچے کو اس کی کامیابی پر مبارکباد دینے کے لیے اس کے پاس پہنچا تو میں نے بچے کے گھروندے کو غور سے دیکھا۔ اس نے پتوں کے پتل کے علاوہ ٹہنی کی چھوٹی چھوٹی شاخوں کو شہتیر کے طور پر استعمال کیا تھا۔ کچھ پتوں کے پیڑ بنا کر اس نے گھروندے کے اردگرد ایک ہرا بھرا باغ بھی بنا ڈالا تھا۔

اور بچے کا چہرہ اس ہرے بھرے باغ کی طرح ہی یوں لہک رہا تھا جیسے اس باغ میں چاروں طرف خوشیوں کے پھول کھل اُٹھے ہوں۔ بچہ یوں محسوس کر رہا تھا جیسے وہ پریوں کے دیش میں پہنچ گیا تھا۔

مجھے اپنے پاس آتا دیکھ کر بچہ تھوڑی دیر کے لیے پریوں کے دیش سے واپس میری دُنیا میں آ گیا اور مجھے میرے نام سے پکارا۔

لیکن تمہیں میرا نام کیسے معلوم ہوا؟

میں نے پانی کے بہاؤ پر بہتے آپ کے نام کو پڑھ لیا تھا اور اسی سے میرے دل میں اُمید جگی تھی کہ اگر پانی پر لکھی تحریر باقی رہ سکتی ہے تو میرا ریت کا گھروندہ بھی بن سکتا ہے۔

''تو گویا ہم دونوں ایک دوسرے کی طاقت بن رہے تھے۔ ایک دوسرے کو زندگی دے رہے تھے۔ راہ دکھا رہے تھے۔''میں نے سوچا۔

بس یہی کچھ سوچتے ہوئے بچے کی طرف دیکھ رہا تھا کہ وہ بولا۔''یہ دیکھئے۔ میں نے تو آپ کا نام اپنے گھر ندے پر بھی لکھ دیا ہے۔

پھر اس نے جیب سے موم کا دیا نکال کر روشن کیا۔ اسے اپنے گھروندے کے اندر رکھا اور پتل سمیت گھروندے کو اٹھا کر وقت کی لہروں کے حوالے کر دیا۔

گھروندہ بہتا ہوا ہم سے دور چلا گیا ہے۔ اس کے اندر رکھا موم کا دیا ٹمٹما رہا ہے۔ بچے کی آنکھوں میں ٹمٹماتی انگنت خوشیوں کو دیکھ کر میری تمام ادھوری خوشیاں ماضی کے اندھیروں کو چیر کر مجھ سے یوں لپٹی جا رہی ہیں جیسے کوئی محبوبہ ہجر کے مارے عاشق کی سانسوں کو مہکاتی اس کے وجود میں اترتی جا رہی ہو۔

وقت کے بہاؤ پر اپنا نام لکھنے میں مجھے کامیابی ملی ہے یا نہیں، اس کے بارے میں پورے وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن اتنا واضح ہے کہ اس بچے کے دل کی تختی پر میرا نام ٹھیک اسی طرح روشن ہو گیا ہے جس طرح دِیا جلنے سے اس کا گھر ندہ روشن ہوا اُٹھا تھا۔

○○○

ایک ناؤ کے سوار

ناؤ میں دو آدمی سوار تھے۔

ایک چاہتا تھا۔ ''ہے بھگوان۔ یہ ناؤ مجھے جلدی پار لگائے۔

دوسرا بھگوان سے پرارتھنا کر رہا تھا۔ ''ہے بھگوان یہ ناؤ تو ڈوب ہی جائے۔''

پہلی آدمی سکھی تھا۔ اور بہت سے سکھ دوسرے کنارے پر اس کا انتظار کر رہے تھے۔

دوسرا آدمی بے حد دکھی تھا۔ مزید پریشانیاں دریا پار کی دنیا میں منہ بائے کھڑی تھیں۔

اپنی اپنی ضرورت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے سکھی آدمی نے ناؤ والے سے کہا کہ بھائی ذرا پتوار تیز تیز چلاؤ تا کہ میں اُس پار جلدی پہنچ سکوں۔

دوسرا آدمی جو اپنے غم میں ڈوبا پریشان سا تھا اُس نے پہلے مسافر کی بات کو سُنا۔ پہلے تو اُسے کچھ سمجھ ہی نہیں آئی۔ لیکن پھر پریشانی کے عالم میں اُس مسافر کے الفاظ کو فضا سے دوبارہ اِکٹھا کر کے سُنا اور اُس کے مفہوم کو کچھ کچھ سمجھا تو اس نے ملاّح سے کہا۔ ''نہیں بھائی۔ ملاح۔ تیز جانے کی ضرورت نہیں۔ میں تو کہتا ہوں۔ اس ناؤ کو کسی بھنور میں پھنسا دو۔ ایسا بھنور جس سے یہ کبھی باہر نہ نکل سکے۔ ڈوب جائے۔ پاتال میں چلی جائے۔ دُنیا والوں کو ڈھونڈنے پر بھی نہ ملے۔''

اس سے آگے پتہ نہیں وہ کیا کیا بڑبڑاتا رہا۔ اُس نے یہ کہنے کی بھی ضرورت نہ سمجھی کہ پتوار کو آہستہ چلاؤ۔

ہاں جب مقصد ہی یہ ہے کہ ناؤ ڈوب جائے تو پھر پتوار کے آہستہ یا تیز چلنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔

سکھی مسافر نے جب دوسرے مسافر کی بات سنی تو اُس نے اُس کی طرف لاتعلق نظروں سے دیکھا اور من ہی من میں سوچا کہ پتہ نہیں لوگ مرنا کیوں چاہتے ہیں؟ کچھ دیر تو اُس کے بارے میں اندازے لگاتا رہا، لیکن پھر اُس نے دوسرے کی زندگی میں ٹانگ اُڑانا مناسب نہ سمجھا۔

یوں بھی وہ اپنے سکھوں کی دُنیا میں اس قدر رنگا ہوا تھا کہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اُس پر دوسروں کے دُکھوں کا سایہ پڑے۔ اس لیے اس نے ملاح کو ایک بار پھر تاکید کی کہ وہ پتوار تیز تیز چلائے۔

''نہیں بھائی۔ آہستہ آہستہ چلو۔ بلکہ ہو سکے تو ناؤ کو لہروں کے حوالے کر دو۔ پتوار چلاؤ رہی نہیں۔'' دوسرے آدمی نے کہا۔

ملاح نے اُن دونوں کی بات کی طرف کوئی دھیان نہ دیا۔ ملاح کا تو کام ہے پتوار چلانا۔ اور ناؤ کو ایک کنارے سے دوسرے کنارے پہنچانا۔ اُسے اپنے مسافروں کی نجی زندگی سے کچھ لینا دینا نہیں ہوتا۔ یوں بھی اُس وقت دریا میں باڑھ آئی ہوئی تھی۔ پانی کی رفتار تیز تھی۔ معمول سے بہت تیز۔ دریا کا پاٹ بھی زیادہ پانی آجانے کی وجہ سے زیادہ چوڑا ہو گیا تھا۔ ہوا بھی کچھ مخالف تھی۔ اِس لیے ایک تو اُسے دریا کی لہروں کو کاٹنے اور اُس کے رُخ کو دوسرے کنارے کی طرف رکھنے کے لیے کافی محنت کرنی پڑ رہی تھی۔ ناؤ کو کھیتے ہوئے راستے پر رکھنے کے لیے زیادہ زور لگانا پڑ رہا تھا۔ لہروں کی تیزی کے سامنے اُس کے پتواروں کی کوئی پیش نہیں چل رہی تھی۔ ایسے میں اپنے بازوؤں میں مزید طاقت بھرنے کے لیے اُس نے ایک ماجھی گیت گانا شروع کر دیا۔

ملاح کا گیت سُن کر سکھی مسافر پر نشہ سا سوار ہو گیا۔ اُس کے انگ انگ میں سُرور بھر گیا۔ کیا گیت ہے۔ اُسنے من ہی من میں سوچا۔ ایک ان پڑھ ملاح زندگی کے کتنے بڑے بھید کو آشکار کر رہا ہے کہ پانی آتا رہتا ہے، جاتا رہتا ہے۔ لیکن دریا کہیں نہیں جاتا۔ وہ اُسی طرح گھاٹ پر ہر وقت موجود رہتا ہے۔ اسی طرح دُنیا میں بندے آتے ہیں۔ اپنی عمر بتا کر بندے چلے جاتے ہیں۔ لیکن یہ زندگی دریا کی طرح زمین کے پاٹ پر ہر وقت موجود

رہتی ہے۔ اُس مسافر کو لگا کہ جیسے دریا کی لہروں کی شائیں شائیں، ملاح کے پتوار کی چھپ چھپ اور ملاح کے الفاظ مل کر ایک ایسے گیت میں ڈھل گئے ہیں جو دریا کے پاٹ سے اُٹھ کر سارے برہمنڈ پر چھا رہا ہے۔ اوپر آسمان کو اپنے سُروں میں سمیٹ رہا ہے اور وہ ملاح جیسے ایسا کھیون ہار ہے جو اسے اس دُنیا سے اُٹھا کر کسی انجانی دُنیا میں لے گیا ہے یا لے جا رہا ہے۔

وہ سکھی مسافر اپنے خیالوں میں اس طرح ڈوبا اپنی ناؤ سے اوپر اُٹھ کر پتہ نہیں کن آسمانوں کی روح پرور فضاؤں میں سیر کر رہا تھا۔ اُس کا وجود جیسے ہلکا پھول ہو گیا تھا۔ خوشبو ہو گیا تھا اور وہ خوشبو بن کر چاروں طرف پھیل گیا تھا۔

''گاؤ اور گاؤ۔''

پتوار چلاؤ۔ اور تیز چلاؤ۔

اُسے پتہ نہیں تھا۔ لیکن اُس کے ہونٹ یہ الفاظ ادا کر رہے تھے۔

اِس کے برعکس ناؤ میں دوسری طرف بیٹھے دُکھی آدمی کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ ملاح کے پتوار کی چھپ چھپ اُس کے ذہن پر اُس کے دِل و دِماغ پر ہتھوڑے کی سی چوٹ کر رہی تھی۔ کراری چوٹ۔ اُسے لگ رہا تھا کہ اُس کا سر، جو ذہنی پریشانیوں کی وجہ سے پہلے سے چکرا رہا تھا، پتواروں کی چھپ چھپ کی چوٹ سے جیسے پھٹ ہی جائے گا۔ پہلے پہل ناؤ میں بیٹھ کر جب اُسے چکر سا آیا تھا تو اُس کا خیال تھا کہ چاروں طرف دوڑتی اور ناؤ کے گرد چکر کاٹتی ہوئی لہروں کی وجہ سے وہ ایسا محسوس کر رہا ہے جیسے اُسے چکر آ رہا ہو۔ لیکن تھوڑی دیر بعد جب اُس کے ماتھے پر ٹھنڈی ہوا کے ٹکرانے کے باوجود پسینے کے قطرے پھسلنے لگے تو اُس کو یہ احساس ہوا کہ پتوار کی چھپ چھپ اُس کی کنپٹیوں پر چوٹ پر چوٹ لگا رہی تھی۔ اور پھر جلتی پر تیل ڈالا ملاح کے گیت نے۔ کیسا بے ہودہ گیت ہے۔ اور کیسا بے سُرا گا رہا ہے۔ جیسے بوجھ کے نیچے دبا ہوا گدھا ڈکچوں ڈکچوں کر رہا ہو۔ وہ بوکھلا سا گیا۔ تبھی اُس کا دھیان دریا میں چکر کھاتی ایسی لہروں کی طرف گیا، جہاں بھنور کی صورت، پانی میں ایک گڈھا سا بن رہا تھا۔ اُسے لگا جیسے وہ اُن لہروں میں پھنسا نیچے ہی نیچے اُترتا جا رہا ہو۔ نیچے

اور نیچے۔ دریا کا وہاں پر کوئی تلا نہیں۔ جیسے زمین وہاں پر پھٹ گئی ہو، اور وہ نیچے ہی نیچے پاتال تک پہنچ گیا ہو۔ پاتال، جہاں ہر چیز پانی کی تھی۔ اُس کے نیچے پانی اُس کے اوپر پانی۔ اور وہ ڈوب رہا تھا۔ نہیں اُس کا تو جسم ہی پانی کا بن گیا تھا۔

بند کرو یہ بک بک۔

بند کرو یہ چھپ چھپ۔

غصّے میں تلملا کر دُکھی آدمی کا پانی بنا وجود ہاڈ مانس کا سم بن گیا تھا۔

بڑبڑا کر ملاح کا گیت بنا وجود ہاڈ مانس کا بن گیا اور اُسے لگا کہ وہ ناؤ میں بیٹھا ہے اور پتوار چلا رہا ہے۔

ملاح کے گیت کا سُر ٹوٹا تو سُکھی آدمی کا خوشبو بنا وجود آسمانوں کی بلندیوں سے اُتر کر پھر ناؤ میں آ کر بیٹھ گیا اور دیکھنے لگا کہ ناؤ نے کتنا فاصلہ طے کیا ہے۔ یا وہ دوسرے کنارے سے کتنا دُور ہے۔

تبھی اصلیت کو بھانپ کر سُکھی آدمی کی اُوپر کی سانس اُوپر اور نیچے کی سانس نیچے ہی رہ گئی۔ اُس نے گھبرا کر دیکھا۔ ناؤ بڑے سے بھنور میں پھنسی ایک ہی جگہ یوں چکر پر چکر لگا رہی تھی جیسے ہماری دھرتی اپنے محور پر سورج کے گرد چکر کاٹا کرتی ہے۔ دونوں میں فرق صرف یہ تھا کہ دھرتی کا چکر کاٹنا کسی کو محسوس نہیں ہوتا اور ناؤ کے چکر کھانے کی وجہ سے اُسے چکر آنے شروع ہو گئے تھے۔

ملاح ناؤ کو اُس بھنور سے نکالنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا تھا۔

دُکھی آدمی نے ناؤ کو چکر کاٹتے دیکھا تو اُس کے دِل کو سکون سا ملا۔ اُسے لگا کہ بھگوان نے اُس کی سُن لی ہے۔ تھوڑی ہی دیر کی بات ہے۔ ناؤ ڈوب جائے گی اور اُسے دُنیا کے تمام دُکھوں سے نجات مِل جائے گی۔

سُکھی آدمی کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ وہ اپنی جگہ پر بیٹھا اپنی ساری طاقت ملاح کو دے آ رہا تھا۔ اپنے بازوؤں کی طاقت کو ملاح کے بازوؤں میں بھر رہا تھا تا کہ اُسے ناؤ کو ڈوبنے سے بچانے کے لیے مدد مل سکے۔ اُس کا سارا وجود پتوار بن گیا تھا

اور اُس کے سُلھوں بھری زندگی کی دُشمن ہو رہی ایک ایک لہر سے لڑ رہا تھا۔

ملاح تو ناؤ کو بھنور میں پھنسا دیکھ کر ملاح رہ ہی نہیں گیا تھا۔ وہ خواجہ خضر بن گیا تھا۔ حضرت نوح بن گیا تھا۔ جیسے اُس کے ذمے اُس کی ناؤ میں بیٹھے دو آدمیوں کو نہیں بلکہ پوری زندگی کے وجود کو بچانا تھا۔ پوری دھرتی کو بچانا تھا۔ دھرتی جو ساری زندگی کا منبہ ہے، اُسے بچانا تھا۔

وہ اپنا پورا تان لگا رہا تھا۔ اُس نے اپنے بازوؤں میں دوڑ رہے خون کو جیسے اپنے ہاتھوں میں پکڑے پتواروں میں بھر دیا ہو۔ وہ پتوار جاندار بن کر پانی کی لہروں سے لڑ رہے تھے۔ جو جھر رہے تھے۔

اور پھر یہ ہوا کہ جب ایک انسان کا خون دوسرے آدمی کے وجود میں طاقت بن کر دوڑا اور ملاح کے بازو ہی پتوار بن گئے تو لہریں ہار گئیں۔ بھنور ہار گیا، دریا ہار گیا اور ناؤ ایک میل کا لمبا چکر کاٹتی ہوئی بھنور سے باہر نکل آئی۔ اور دوسرے کنارے کی طرف دھیرے دھیرے یوں بڑھنے لگی جیسے... جیسے آپ نے کنول پھول کو پانی پر تیرتے دیکھا ہوگا.....ویسے۔

ناؤ جب پرسکون لہجے میں دھیرے دھیرے سرکتی ہوئی دوسرے کنارے کی طرف بڑھ رہی تھی تو ملاح پھر حضرت نوح کا چولا اُتار کر عام ملاح بن گیا۔ اپنی ناؤ اور ناؤ پر سوار دو آدمیوں کی جان بچا کر جیسے اُس نے ساری دُنیا کو ڈوبنے سے بچا لیا تھا۔

ایسے موقع پر اُس کی خوشی اُس کے ہونٹوں پر گیت بن کر تھرک اُٹھی۔

ندی بہتی جائے۔
ندی رہتی جائے۔
ہم بہیں بھی اور رہیں بھی۔
کوئی ایسا کردا پائے رے۔
پانی آئے رے، پانی جائے رے۔

ملاح کے گیت کے یہ بول جب دریا کی لہروں پر تیرتے ہوئے دُور فضاؤں میں بکھر

رہے تھے تو سُکھی آدمی دیکھ رہا تھا کہ ناؤ کو ڈوبنے سے بچا کر ملاح کو کس قدر سُکھ ملا تھا، ایک سُکون تھا، خوشی تھی جو روشنی کا ہالہ بن کر ملاح کے چہرے کے گرد پھیل رہی تھی۔ گیت کے بول بن کر فضا میں بکھر رہی تھی۔ اُس نے ناؤ کو ڈوبنے سے نہیں بچایا تھا، اُس کے سُکھوں کو بھی ڈوبنے سے بچایا تھا۔ اور صرف اُس کے سُکھوں کو ہی نہیں، اُس کے رشتے دار، دوست احباب، اُس کے جاننے والے جن کے ساتھ مل کر وہ سُکھوں کو بھوگتا ہے، اُن سب کے سُکھوں کو بچایا ہے۔ جس طرح پانی میں کنکر پھینکا جائے تو اُس میں لہروں کا ایک دائرہ سا بنتا ہے، اُسکی لہریں دُور تک پھیلتی چلی جاتی ہیں، اِسی طرح اُس کے سُکھوں کی لہریں بھی دُور تک پھیلتی چلی جائیں گی۔

اور پھر سُکھی آدمی نے سوچا۔ میں نے تو صرف نظروں ہی نظروں میں ملاح کی ہمت بندھائی تھی۔ جذباتی سطح پر ہی اُس کی حوصلہ افزائی کی تھی، اور اُس نے ناؤ کو ڈوبنے سے بچالیا۔

ایسے میں اگر میں حقیقی طور پر اِس دُکھی آدمی کی مدد کروں تو کیا.....

اُس نے نظریں اُٹھا کر ناؤ کے دوسرے کنارے پر بیٹھے دُکھی آدمی کی طرف دیکھا۔

اُس کا چہرہ غمگین تھا۔ اُسے لگتا تھا کہ پانی کے بھنور سے تو وہ بچ کر آ گیا ہے لیکن دریا کے دوسر کنارے پر دُکھوں کے جو بھنور اُس کا انتظار کر رہے ہیں، اُن سے بچنا محال ہوگا۔

اُس کی نظریں اب بھی پیچھے چھوٹ گئے دریا کے اُس حصّے پر جمی تھیں جہاں پانی کے گہرے بھنور بن رہے تھے۔

''نہیں۔ میں اسے ڈوبنے نہیں دوں گا۔ سُکھی آدمی نے سوچا۔

وہ اپنی جگہ سے اُٹھا اور ناؤ کے دوسرے حصّے میں جا کر دُکھی آدمی کے پاس بیٹھ کر اُس کے کندھے پر ہمدردی کا ہاتھ رکھ دیا۔

ناؤ پانی کی ہموار لہروں پر دھیرے دھیرے سرکتی دوسرے کنارے کی طرف بڑھ رہی تھی۔

○○○

مداوا

ایک سیلانی کی حیثیت سے میں اس اجنبی ملک میں سارا دن گھومتا رہا تھا۔ اُس دن پہلے تو میں وہاں کے سترہویں صدی کے ایک قومی شاعر کے گھر کو دیکھنے گیا۔ وہ شاعر پیشے سے کسان تھا۔ وہاں کی موجودہ سرکار نے اپنے قومی شاعر کے گھر کو قومی جائیداد کی طرح سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ گھر کیا تھا کچی دیواروں کے اوپر ٹنگا ہوا گھاس پھوس کا چھپر تھا۔ اُس گھر کے ایک حصّے میں جانور بندھے تھے۔ اُن کے سامنے چارہ بھی پڑا تھا۔ ملحق کمرے میں کھیتی باڑی کا سامان تھا۔ ہل درانتیاں اور دوسری چیزیں۔ تیسرے حصّے میں ایک چولہا جل رہا تھا۔ کھانے پینے کے برتن تھے۔ اُسی کے گرم حصّے میں ایک مرغی اور مرغا چونچیں لڑائے آنکھیں موندے سو رہے تھے۔ اُن کے پنکھوں کے نیچے اُن کے چوزے دُبکے ہوئے تھے۔

یہ دیکھنے کے بعد پتہ نہیں میرے قدم مجھے وہاں کے کس اجنبی شہر میں لے گئے۔ وہاں پہلے تو میں ایک بس پر سوار ہو کر اُس شہر کی صدیوں پرانی عمارتوں کو دیکھتا رہا۔ بس کے سفر کے بعد اُس شہر کو اور قریب سے دیکھنے کا تجسس بڑھا تو پھر پیدل ہی وہاں کے بازاروں اور کھلی سڑکوں اور اُن سے نکلتی تنگ گلیوں میں گھومتا رہا۔

شام ہوتے ہوتے جب سورج مشرق سے مغرب تک کا سفر تمام کر کے غروب ہونے لگا تو میں بھی اُس دھرتی کے اجنبی خطّے کے اجنبی شہر میں اجنبی لوگوں کے بیچ دُنیا کا نظارہ کرتے ہوئے سورج کی طرح بالکل اکیلا تھا۔ اُس بسی بسائی دُنیا میں تمام مخلوق کے بیچ سے گزرتا ہوا صرف میں خود ہی اپنے ساتھ تھا۔

اور اب پوری طرح تھک چکا تھا۔ میرے اندر اب ایک بھی قدم اور اُٹھانے کی ہمت

نہیں بچی تھی۔ جب ٹانگوں کے جواب دے جانے پر میں نے خود کو پوری طرح لاچار پایا تو سب سے پہلے جس گھر کا دروازہ دکھائی دیا میں نے وہاں دستک دے ڈالی۔

میری دستک پر جس عورت نے دروازہ کھولا، وہ مجھے دیکھتے ہی آگ بگولہ ہو گئی۔ دروازہ کھولنے سے پہلے ہی وہ غصے میں بڑبڑاتی ہوئی کہہ رہی تھی۔

''یہ گھر آنے کا وقت ہے تمہارا''

''گھر کی فکر کچھ ہو تب تو''

''کوئی مرے کوئی جیے۔ تمہیں کاہے کی فکر۔ دِن بھر آوارہ گردی کرنے سے ہی فرصت نہیں۔''

''مجھے دروازے پر دیکھتے ہی اُس کا پارہ اور چڑھ گیا۔ ''شکل دیکھو کیا بنا رکھی ہے۔ پہچان میں بھی نہیں آ رہے۔''

اس میں کوئی شک نہیں دن بھر کی مسافت میں اتنی دھول میرے سر کے بالوں، چہرے اور ہاتھ پاؤں پر اٹ چکی تھی کہ میرا حلیہ بگڑا ہوا تھا۔ میری حالت ایسی ہو رہی تھی کہ شاید میں خود بھی خود کو پہچان نہ پاتا۔

نقاہت کے مارے یوں بھی حال سے بے حال ہو رہا تھا۔ اس لیے اس عورت کی لعنت ملامت کا کوئی اثر ہونے کے بجائے میرے دل میں ایک اطمینان سا پیدا ہو رہا تھا کہ یہ عورت کم از کم مجھے اجنبی یا غیر نہیں سمجھ رہی ہے۔ ویسے بھی جب میں گھر جاتا ہوں تو عام طور پر میرا استقبال اسی طرح ہوتا ہے۔ اس لیے جیسے جیسے وہ مجھے ڈانٹ رہی تھی ویسے ویسے مجھے یقین ہو رہا تھا کہ میں واقعی ٹھیک جگہ پر آ گیا ہوں۔

وہی ہوا۔ دوسرے ہی لمحے اُس عورت کا غصہ کچھ ٹھنڈا ہوا تو وہ مجھے بازو سے سہارا دے کر گھر کے اندر لے گئی اور گول کمرے میں بٹھا دیا۔

مجھے کرسی پر نڈھال پڑا دیکھ کر وہ باورچی خانے میں گئی اور گرم گرم کافی اور کچھ بسکٹ میرے سامنے رکھ دیے۔ کافی پی کر مجھے تھوڑی راحت محسوس ہوئی تو میری جان میں جان آ گئی۔

''اب تم نہا لو۔ تھکاوٹ دور ہو جائے گی۔'' یہ کہتے ہوئے اُس نے میل سے اٹے ہوئے میرے کپڑے اُتروانے میں میری مدد کی اور غسل خانے کے دروازے تک چھوڑ آئی۔

''اتنی بھی کیا آوارہ گردی کہ انسان میں چلنے کی ہمت نہ رہے۔'' غسل خانے کا دروازہ بند کرتے ہوئے وہ کہہ رہی تھی۔ لیکن اب اُس کی آواز میں پہلے جیسا غصہ نہیں بلکہ کچھ ایسی نرمی تھی جس میں پیار نہیں تو کم از کم اپنائیت کا احساس ہو رہا تھا۔

حمام کے گرم پانی سے نہا دھو کر جب میں تازہ دم ہوا تو مجھے لگا جیسے صدیوں لمبی مسافت کی تھکاوٹ میل کی طرح اُتر کر پانی کے ساتھ بہہ گئی ہو۔ اب میں پھر نو بہ نو تھا۔

دُھلے ہوئے اُجلے کپڑے پہن کر جب میں حمام سے باہر نکلا تو تازگی کے احساس سے میرے ہونٹوں پر زندگی کی مسکراہٹ بکھر رہی تھی اور ہونٹوں پر مہکتی ہوئی بہار کے کسی نغمے کے بول تھرک رہے تھے۔

اس بیچ اُس عورت نے بھی تازہ دم ہونے کے لیے اپنے چہرے سے غصّے کے میل کو دھو ڈالا تھا۔ بالوں میں کنگھی کر لی تھی اور کھانے کی میز کے ایک کونے کی کرسی پر بیٹھی میرا انتظار کر رہی تھی۔

''تمہیں بھوک لگ رہی ہوگی۔'' اُس نے کہا۔ لطیف سی مسکراہٹ سے میری طرف دیکھا تو میری بھوک بھی دوگنی ہوگئی۔ میرے میز پر پہنچتے ہی اُس نے کڑھی، کبابوں اور سبزیوں کے برتنوں سے ڈھکن اُٹھائے اور کھانا پرس دیا۔

جب ہم دونوں پیٹ بھر کر کھا چکے تو اُس نے نیلی سی بوتل کا ڈھکن کھولا اور میرے اور اپنے لیے شراب کے گلاس بھر دیے۔ اُس کا ایک گھونٹ بھرتے ہی مجھے ایسے لگا جیسے میں سپنا دیکھ رہا ہوں۔ مجھے وہ مشروب امرت لگ رہا تھا اور وہ عورت کوئی اپسرا۔

نہیں وہ اپسرا نہیں تھی۔

عورت ہی تھی۔ کہہ رہی تھی۔

''تمہیں گھر کی ذمے داریوں کا کوئی احساس ہی نہیں ہے۔ ہفتوں گھر سے غائب رہتے ہو۔ مجھ سے اکیلے یہ بوجھ اُٹھایا نہیں جاتا۔ جو کام مرد کے ہیں وہ مرد کو ہی کرنے چاہئیں۔ تمہیں پتہ ہے پیٹر اپنے بیوی بچوں کو بھول کر کسی نئی لڑکی کے ساتھ گھوم رہا ہے۔ اُس کی بیوی آئی تھی۔ کہہ رہی تھی کہ پاپا آئیں تو اُن سے کہیے کہ وہ پیٹر کے کان کھینچیں۔

لیکن میں کہوں کس سے۔'' وہ تھوڑی دیر کے لیے رُکی اور پھر بولی۔ ''میری تو قسمت

ہی کھوٹی ہے۔ تمہیں تو اپنی آوارہ گردی سے ہی فرصت نہیں۔''

وہ اس طرح کی پتہ نہیں اور کتنی باتیں کر رہی تھی۔ لیکن اچھا کھانا کھانے کے بعد مجھ پر غنودگی سی چھا رہی تھی۔ اس لیے میں اُس کی باتیں سُن بھی رہا تھا اور نہیں بھی سن رہا تھا۔

نیند سے بوجھل ہو رہی میری آنکھوں کو بند ہوتے دیکھ کر اُس نے مجھے دو ایک بار جھنجھوڑا۔ ابھی وہ کچھ اور باتیں کرنا چاہتی تھی اُس کی رام کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔

میں نے بڑی مشکل سے بند آنکھوں کو کھولا۔

اُس نے روداد شروع کی۔ وہ جو ہیلن ہے نہ..... لیکن تمہاری آنکھیں تو بند ہو رہی ہیں، اور یہ بات تمہیں اُس وقت سنانے والی ہے جب تم پوری طرح جاگ رہے ہو گے۔ اِسے سن کر تمہاری ساری نیند کافور ہو جائے گی۔

ایسا کہتے ہوئے اُس نے غالباً میری نیند کو پوری طرح توڑنے کی کوشش کی۔ لیکن اس پر بھی جب میری آنکھیں بند کی بند رہیں تو وہ مجھے سونے کے کمرے میں لے گئی۔

میں دُنیا کی تمام مسافتوں کی تھکاوٹ، نقاہت اور فکروں کو بھول کر گہری نیند سو گیا۔

رات کو سوتے میں مجھے ایسے لگا جیسے میں اسکاٹ لینڈ کے کسان قومی شاعر کے گھر کے اُس حصّے میں ہوں، جہاں برفیلی سردی سے بچنے کے لیے چولہا جل رہا ہے۔ آگ کی لپٹیں اُٹھ رہی ہیں اور اُسی کمرے کے گرم حصّے میں وہ عورت مرغی کی طرح میرے ساتھ چونچ سے چونچ لڑاتی آنکھیں موندے سو رہی ہے اور اُس کے لمبے لمبے پنکھ میرے سارے وجود کو ڈھانپے ہوئے ہیں۔

اُن نرم گرم پنکھوں کے نیچے مجھے ایسی راحت ایسی تازگی مل رہی ہے، میں اس طرح نو بہ نو ہوتا جا رہا ہوں، مجھے ایسی توانائی مل رہی ہے کہ جسے پا کر صرف ایک دھرتی تو کیا ساتوں آسمان میں پھیلی تمام کائنات کا سفر آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔

ایسا سوچتے ہوئے مجھے اگلی صبح کا انتظار ہے۔

کسی نئے دیش کے کسی نئے شہر کی مسافت پر مجھے جانا ہے، جہاں پر ایک ایسا ہی گھر ہے اور جہاں ایسی عورت اپنے وجود میں پوری اپنائیت لیے میرے انتظار میں ہے۔

○○○

آخری سطر

اگر کسی کو مارنا ہی مقصد ٹھہرا تو طاقتور کے لیے کمزور کو مارنے کے کئی بہانے مِل جاتے ہیں۔

کیا ہے جی۔ یہ اپنے آپ کو تیس مار خان سمجھنے لگا ہے۔

کیا ہے جی۔ یہ پگڑی اس طرح باندھنے لگا ہے جیسی میں باندھا کرتا ہوں۔

کیا ہے جی۔ جب بھی مجھے آتے دیکھتا ہے، یہ مونچھوں پر تاؤ دینے لگتا ہے۔

چودھری بُشریٰ کو صرف اپنے گاؤں میں ہی نہیں چودھراہٹ کی پوری دُنیا میں اپنی برابری کسی طور منظور نہیں۔ چودھری صاحب کی زمینوں کی ملکیت حالانکہ صرف گاؤں کی حدود میں ہی سمٹی ہوئی ہے لیکن کہنے والے تو یہاں تک کہتے ہیں کہ اس زمین کے بل بوتے پر اُفق تا اُفق پھیلی ہوئی پوری زمین کو وہ اپنے حلقۂ رسوخ میں سمجھتے ہیں۔ اس لیے کسی اجنبی خطے میں جب وہ اپنی پگڑی کے اونچے طرّے کو فضا میں لہراتے ہوئے چلتے ہیں اور کوئی اُن کی شخصیت سے مرعوب ہو کر یا ازارہِ اخلاق اُن کے لیے راستہ چھوڑ دیتا ہے تو انہیں اپنی برتری پر یقین ہو جاتا ہے۔ ایسے موقعوں پر اُن کا سینہ فخر سے یوں پھول جاتا ہے جیسے سانپ پھنکارے مار رہا ہو۔

ایسے میں ترکھانوں کے باڑے کو چودھری بُشریٰ کی پھنکاروں کی زد میں آنا ہی تھا۔

بات دراصل یہ ہوئی کہ ترکھانوں کے کسی بزرگ نے سو پچاس سال پہلے اپنے باڑے میں کچھ پیڑ کہیں سے لا کر لگائے تھے۔ وہ جھنڈ کا جھنڈ جب اپنے پورے جوبن پر آیا تو پتہ چلا کہ وہ پیڑ تو چندن کے ہیں۔ چندن کی لکڑی آپ جانتے ہیں سونے کے

بھاؤ بکتی ہے۔

اِن پیڑوں سے ہونے والی آمدن کی وجہ سے باڑے والوں کی زندگی میں اچانک بہار آ گئی۔ اُن کے جھلسا دینے والی غریبی کے گرم جھونکے ٹھنڈی لطیف ہواؤں میں بدل گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ترکھانوں کے میلے کچیلے بدبو مارتے کپڑے اُجلے ہو گئے۔ کچے مکان، پکے بنوا لیے۔ یہاں تک کہ باڑے کی چہار دیواری جو اکثر بھربھری مٹی کی طرح گرتی رہتی تھی اسے بھی پکا بنوالیا۔

''یہ تو کل کو میرے برابر کھڑے ہو جائیں گے۔''

چودھری بشریٰ کو یہ کبھی منظور نہیں تھا۔

چھوٹے موٹے لوگوں کی تو بات ہی چھوڑو۔ یہ تو دُنیا جانتی ہے کہ چند سال پہلے انہوں نے اپنے ہم پلہ ملکھیوں کے خاندان میں پھوٹ ڈالوا کر اُسے کئی حصوں میں بانٹ کر رکھ دیا تھا۔

ایسے میں اِن ترکھانوں کی بھلا یہ ہمت کیسے پڑی کہ چودھری صاحب کے برابر آنے کی کوشش کریں۔

پہلے تو انہوں نے ترکھانوں پر مقدمہ کر دیا کہ باڑے کے جس حصّے میں چندن کے پیڑ لگے ہیں، وہ زمین شام لاٹ کی ہے۔ شام لاٹ یعنی سارے گاؤں کی سانجھی جائیداد۔ اِس لیے یہ پیڑ ترکھانوں کی ملکیت میں آتے ہی نہیں۔

کچہری میں چودھری کو منہ کی کھانی پڑی۔ ترکھانوں کے پاس باڑے کی ملکیت کے پکے کاغذات موجود تھے۔

جب یہ داؤ نہیں چلا تو چودھری صاحب کے حواریوں نے یہ افواہیں پھیلانی شروع کر دیں کہ چندن کے پیڑوں کے ساتھ سانپ لپٹے ہوئے ہیں۔ اس لیے اِن پیڑوں کی موجودگی میں پورے گاؤں کے لوگوں کے لیے سانپوں کا خطرہ ہر وقت بنا رہتا ہے۔

باڑے والے لوگوں نے لاکھ کہا کہ چندن کے گرد اوّل تو سانپ ہوتے ہی نہیں اور اُن کے جھنڈ میں تو قطعی نہیں ہیں۔ یہ ساری کہانی من گھڑت ہے۔ جھوٹی ہے۔

''ہیں کیسے نہیں۔ سانپ ہیں۔ ہمارے عینی گواہ تو کہتے ہیں سانپ پیڑوں کی ٹہنیوں کے ساتھ سٹ کر چپکے رہتے ہیں۔ اس لیے وہ کسی کو بھلے ہی دکھائی نہ دیتے ہوں لیکن ہیں ضرور۔ اور وہ پورے گاؤں والوں کے لیے خطرہ ہیں۔

دونوں فریقین میں کون سچا ہے اس حقیقت کو جاننے کے لیے کچھ غیر جانب دار لوگوں کے ثالثوں نے بھی موقعے پر معائنہ کرنے کے بعد بتایا کہ انہیں جھنڈ میں کہیں سانپ ہونے کے ثبوت نہیں ملے۔ لیکن چودھری بشریٰ ''میں نہ مانوں'' کی رٹ لگاتا رہا اور کہتا رہا کہ چندن کے پیڑوں میں سانپ نہ ہوں۔ یہ بات کسی طرح بھی قابل یقین نہیں ہے۔

یہی بات دُنیا پر سچ ظاہر کرنے کے لیے ایک دن چودھری کے حواریوں نے ترکھانوں کے باڑے پر دھاوا بول دیا نتیجے کے طور پر چندن کا باغ تو اجڑا لیکن اس کے ساتھ ہی باڑے کے مکینوں کے ساتھ جو گزر گئی وہ کہانی بڑی المناک ہے۔

کہتے ہیں جب کوئی ایک آدمی مرتا ہے تو یہ اُس اکیلے کی موت نہیں ہوتی۔ اُس کی موت کے ساتھ پچھلی سات پشتیں بھی مرتی ہیں اور آنے والی سات پشتیں بھی۔ ایک دیئے کے بجھنے سے اندھیرے میں گُم ہو چکی، پچھلی پشتوں میں اندھیرا اور گہرا ہو جاتا ہے اور ایک دیئے کے بجھنے سے آنے والی سات نسلوں تک پہنچنے والی روشنی میں کچھ کمی واقع ہو جاتی ہے۔

اس لیے تفصیل میں جائے بغیر آپ خود اپنے تصور کی آنکھ سے دیکھ سکتے ہیں۔ صورتحال یہ تھی کہ حضرت وارث شاہ کے الفاظ میں ''دردمندوں کی آہیں'' جب ساتویں آسمان پر پہنچیں تو وہاں کے باشندوں کو احساس ہوا کہ جیسے صرف ترکھانوں کا باڑا ہی نہیں ساری دھرتی کراہ رہی ہو۔

غرضیکہ اس ظلم کے خلاف جب چاروں طرف سے احتجاج ہونے لگے تو چودھری بُشریٰ کو اپنے جامے پر لگے باڑے والوں کے خون کے داغ مٹانے اور دُنیا میں اپنی ساکھ کو برقرار رکھنے کی فکر لاحق ہوئی۔ اس لیے چودھری بُشریٰ اُجڑے ہوئے باڑے کو از سرِ نو آباد کرنے اور زخمیوں پر پھاہا رکھنے کے لیے پیش پیش تھا۔

سب سے پہلے وہ جس گھر میں داخل ہوا وہاں کوئی آدمی زخموں کی مار نہ جھیل پانے پر نزع کی حالت میں اپنی آخری سانسیں گن رہا تھا۔

مر رہے اس آدمی کو اسی حالت میں چھوڑ کر میں آپ کو ایک پرانی کتھا سنانا چاہتا ہوں۔

ایسا کہا جاتا ہے کہ ایک بار موت بڑی خوش خوش زندگی کے گھر آئی۔

''بڑی خوش نظر آ رہی ہو'' زندگی نے موت کا سواگت کرتے ہوئے کہا۔

''خوشی کی بات ہی ہے'' موت نے جوب دیا۔

''کوئی خزانہ ہاتھ لگ گیا کیا؟''

''دُنیا بھر کے خزانے موت کے لیے بھلا کس کام کے۔'' موت کا جواب تھا۔

''تو پھر''

''مجھے امرت مل گیا ہے۔ یہ امرت بھی میرے کسی کام کا نہیں۔ میں چاہتی ہوں یہ تم پی لو۔ تم امر ہو جاؤ گی تو مجھے تمہیں مارنے کے گھناؤنے کام سے نجات مل جائے گی۔''

''مجھے امرت کی تلاش تو ہے'' زندگی نے کہا۔ لیکن.....

لیکن کیا؟ موت نے پوچھا۔

وہ جو روزِ اوّل سے مجھے اپنا شکار بناتی رہی ہے اُس موت کے ہاتھ سے لے کر امرت پینا مجھے منظور نہیں۔

یہ کہانی سنانے کے بعد مجھے اصل کہانی کی آخری سطر لکھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

○○○

اُجڑا ہوا ٹیلہ

اس اجڑے ہوئے ٹیلے پر میں بالکل اکیلا کھڑا ہوں۔ اس حد تک اکیلا کہ وہ جو کہتے ہیں نہ کہ ''سایہ بھی ساتھ چھوڑ گیا'' تو یہ کہاوت میرے اکیلے پن کے درد کو پوری طرح بیان کرنے سے قاصر ہے۔ سائے کا تو کوئی وجود ہی نہیں ہوتا۔ وہ اگر ساتھ بھی رہے تو انسان کے کس کام آسکتا ہے۔ یہاں تو یہ حال ہے کہ ٹانگیں تھکاوٹ سے چور ہیں۔ یہی حال بازوؤں کا ہے۔ کمر میں اس قدر درد ہے کہ ببول کے جس پیڑ سے ٹیک لگائے بیٹھا ہوں اس کی ایک گانٹھ میری ریڑھ کی ہڈی میں کانٹے کی طرح گڑ رہی ہے لیکن میرے اندر اتنی سکت نہیں کہ ذرا سا سرک کر ادھر اُدھر ہو جاؤں۔ اور تو اور میری آنکھوں میں اس قدر تھکاوٹ بھری ہوئی ہے کہ میں پلکیں اُٹھا کر ادھر اُدھر دیکھنے کی کوشش بھی نہیں کر رہا۔

اس سے زیادہ اکیلا پن اور کیا ہوگا کہ اپنے جسم کے انگ ہی ساتھ دینا چھوڑ دیں۔ ایک تو ٹیلا اجڑا ہوا۔ دوسرے ٹیلے پر پھیلا ہوا سناٹا۔ تیسرے اردگرد کا سونا پن۔ اس سونے پن میں کوئی مکھی بھنبھناتی ہے تو لگتا ہے سناٹا بول رہا ہے۔ وہ پنکھ پھڑ پھڑاتی ہے تو لگتا ہے کہ ماحول کا سونا پن میرے اندر داخل ہونے کے لیے پنکھ تول رہا ہے۔

ایسے میں میرے اکیلے پن کا احساس اور بڑھ جاتا ہے۔ میں گھبرا کر نقاہت کے مارے ہل نہ پا رہی گردن کو تھوڑا بہت گھما کر ادھر ادھر دیکھتا ہوں تو لگتا ہے کہ میرے اردگرد بکھرا سناٹا دھول کی صورت اڑ کر افق پر بھی اپنے پاؤں پھیلا رہا ہے اور میرا تھکا ہوا ذہن یہ فیصلہ نہیں کر پاتا کہ حقیقت کیا ہے۔ سناٹا افق سے اتر کر ٹیلے کی طرف آ رہا ہے یا ٹیلے سے اڑ کر افق کی طرف جا رہا ہے۔

اپنے اکیلے پن کے احساس کو مٹانے کے لیے میں نے سناٹے سے بات کرنا چاہی۔ وہ خاموش رہا۔ میں نے سونے پن کو آواز دی۔ وہ پٹ پٹ آنکھوں سے میری طرف دیکھتا رہا۔ میں نے چلتی ہوئی ہوا کو پل بھر کے لیے روکنا چاہا۔ وہ خود ٹیلے کے سونے پن سے گزرتے ہوئے پریشان سی تو تھی ہی ببول کے کانٹوں کی چبھن سے اس کے اندر سے درد کی ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ ایسے موقع پر آدمی ایک پل کے لیے رُک جاتا ہے۔ لیکن ہوا سناٹے سے اس قدر سہمی ہوئی تھی کہ وہ درد کو سہتے ہوئے بھی نہ رُکی اور سرسر کرتی جلدی جلدی آگے بڑھ گئی۔

اس ماحول میں میں کیا کروں۔ میری حالت تو اور بھی غیر ہو رہی تھی۔ تبھی میرے کانوں میں سیٹی کی سی آواز سنائی دی۔ شاید کوئی آس پاس ہے۔ یہ احساس ہی میرے لیے تنکے کے سہارے جیسا تھا۔ لیکن یہ احساس بھی زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا۔ بات دراصل یہ تھی کہ جب کبھی ہوا ٹیلے پر سے ہوتے ہوئے کسی بل یا درار کے اندر سے ہو کر گزرتی تھی تو سیٹی سی بج جاتی تھی۔ ''نہیں یہ سیٹی کی آواز نہیں۔'' میں نے سوچا یہ ٹیلا ہی اپنے سونے پن سے گھبرا کر کراہ رہا ہے۔ یہ ٹیلے کے درد کی ٹیسیں تھیں۔'' میں نے سوچا۔

اگر یہ ٹیلہ کراہ رہا ہے۔ تو کیا یہ زندہ ہے؟۔ اگر اس کے وجود سے درد کی ٹیسیں اُٹھ رہی ہیں تو کیا اپنے اوپر چھائے سونے پن سے سہما ہوا ہے؟

اس طرح کے کئی سوال میرے ذہن میں رینگ گئے۔

تبھی میری نظر ایک گلہری پر پڑی۔ جس طرف سے تھوڑی دیر پہلے میں آیا تھا، اسی طرف سے گلہری اس ٹیلے کی ٹیسی پر پہنچی تھی۔ مجھے ببول سے ٹیک لگائے دیکھ کر وہ ٹھٹھکی اور کتنی دیر تک زمین سے چپکی بٹر بٹر میری طرف ایک ٹک دیکھتی رہی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ ٹیلے کے اجڑے پن سے، اس کے سناٹے سے، اس کے سونے پن سے پہلے سے مانوس تھی اور ٹیلے پر زندگی کی اور کوئی نشانی دیکھنے کی عادی نہیں تھی۔ اسی لیے وہ حیران حیران سی میری طرف دیکھ رہی تھی۔

آخر اس نے اپنی حیرانی پر قابو پایا اور پھدکتی ہوئی پہلے تو پیڑ کے پیچھے کی طرف گئی۔

وہاں سے جست لگا کر پیڑ کے دوشاخے پر پہنچی اور دوسری جست میں اس سے اوپر والی شاخ پر پہنچنے کی کوشش میں ایک کانٹے دار ٹہنی سے الجھ گئی۔ وہاں اسے کانٹے جو چبھے تو وہیں سے چھلانگ لگا کر جس طرف سے وہ ٹیلے پر چڑھی تھی اسی ڈھلان سے نیچے اُتر گئی۔

میں نے اسے نیچے جاتے ہوئے دیکھا تو پریشان ہوگیا، ٹیلے کے سناٹے نے ببول کے کانٹے چبھو کر اسے لہولہان کر دیا تھا۔ اس کے جسم کی دھاریوں پر کئی جگہ خون کے لال لال دھبّے سے چمک رہے تھے۔

گلہری کو ٹیلے پر آتے ہی زخمی ہوتے دیکھا تو میں نے گھبرا کر اپنے جسم کا جائزہ لیا۔ نہیں! میرے جسم پر ابھی کوئی کانٹا نہیں چبھا تھا۔ کہیں خون نہیں رس رہا تھا۔ ہاں تھکاوٹ اسی طرح باقی تھی لگتا تھا جیسے میرے ہاتھ، پاؤں، ٹانگیں میرے جسم کے ساتھ جڑے ہونے کے باوجود نہیں جڑے ہوئے تھے۔

ایک تو میں اپنے اکیلے پن سے پریشان تھا۔ اوپر سے گلہری کے زخمی ہونے پر میں اور دُکھی ہوگیا۔ اس سے کچھ راحت پانے کے لیے میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا، اور سوچا کہ دماغ بھی کچھ دیر کے لیے کچھ نہ سوچے۔ لیکن ایسا ممکن نہ ہوسکا۔ مجھے ایسے لگا کہ آنکھیں بند کرتے ہی میری آنکھوں میں بھرا ہوا سناٹا کانٹے بن کر چبھنے لگا۔ کہیں یہ کانٹے میری آنکھوں کو ہی زخمی نہ کر دیں۔ میں نے گھبرا کر جلدی سے آنکھیں کھولیں تو میری نظر میرے اردگرد بکھرے ببول کے پھولوں پر گئی۔ ان میں سے ایک پھول لال رنگ کا تھا۔

''ببول کا پھول تو لال رنگ کا ہوتا نہیں۔ یہ عجوبہ کیسے ہوا؟'' میں نے بازو بڑھا کر اس پھول کو اٹھایا تو تڑپ اُٹھا۔ وہ پھول گلہری کے خون کے قطرے سے لال ہوگیا تھا، اور اب اس کی لالی میری انگلیوں کے پوروں پر بکھر رہی تھی۔

مجھے سناٹا کاٹنے لگا۔

سونا پن اکھرنے لگا۔

اکیلا پن چبھنے لگا۔

میرے دل سے درد کی ٹیس اُٹھی اور کراہ بن کر ٹیلے پر بکھر گئی۔

جس جگہ سے میں نے لہو سے داغدار پھول اُٹھایا تھا، میری نظریں وہاں پر مرکوز ہو کر رہ گئیں۔ پتہ نہیں میں کتنی دیر تک اسی جگہ پر نظریں جمائے رہا۔

پھر پتہ نہیں کیسے ہوا۔ کیونکر ہوا۔ میری تیکھی نظروں نے وہیں کی زمین کو چھید ڈالا تھا یا نیچے سے موٹی ہوتی ببول کی جڑ نے ٹیلے کی زمین میں درار بنا دی تھی۔ کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ میں نے دھیان سے اس درار کے اندر جھانکا تو مجھے کوئی گول سی چیز دکھائی دی۔ درار کو ذرا سا چوڑا کیا تو میرے ہاتھ میں ایک چوڑی آ گئی۔ پتہ نہیں وہ چوڑی کب سے اس ٹیلے میں دفن تھی اور اب کھلی ہوا میں سانس لینے کے لیے درار کے راستے اوپر آ گئی تھی۔

اس چوڑی کو ہتھیلی پر رکھ کر میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ہو نہ ہو، اس ٹیلے کے نیچے پوری زندگی دفن ہے اور ممکن ہے اس کے اندر دبی زندگی سانس لے رہی ہو۔ سانس کی اس آواز کو سننے کے لیے میں نے اپنا کان ٹیلے کی مٹی سے لگا دیا اور سننے کی کوشش کرنے لگا۔ کبھی لگتا کہ زندگی سانس لے رہی ہے۔ کبھی لگتا کہ ٹیلا سانس لے رہا ہے۔ کبھی لگتا کہ نہیں۔ کچھ نہیں ہے۔ ایسے ہی میرا وہم ہے۔ نہیں وہم نہیں ہو سکتا اگر اس کے اندر دبی زندگی نہ ہو تو پھر یہ چوڑی کس کی ہے۔

میں نے ایک دفعہ پھر ہتھیلی پر رکھی چوڑی کی طرف دیکھا اور اسی سے پوچھا۔ ''تم کس کی ہو۔''

''یہ میری ہے۔'' ایک حسینہ میرے اوپر جھکی ہوئی مند مند مسکراتی اپنی چوڑی مانگ رہی تھی۔ میں نے اسے دیکھنے کے لیے نظریں اُٹھائیں تو اس نے شرما کر چہرے کو گھونگھٹ میں چھپانے کی ایسی کوشش کی کہ وہ اپنا نورانی چہرہ چھپا بھی رہی تھی اور دکھا بھی رہی تھی۔

میں ہکا بکا اس کے حسن کا نظارہ کر رہا تھا۔ آنکھ ایسی کٹیلی کہ اس کی تیکھی نظروں کے بان سینے کو چھید کر دل میں دھنستے چلے جا رہے تھے۔ آنکھیں ایسی ماہتابی کہ وہ جس طرف کو چہرہ گھمائے اسی طرف روشنی پھیلتی چلی جائے۔ ہونٹ ایسے کہ بنا بولے ہی سب کچھ بول رہے تھے۔ میرے کچھ بولنے کی تو کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔ تبھی اس نے ایک لمبی سانس لی اور پھر

اس نے جو سانس چھوڑی ہے تو، توے کی دھیمی آنچ پر سنکتی ہوئی روٹی کی جیسی سوندھی سوندھی خوشبو ہوتی ہے بس ویسی ہی خوشبو فضا میں بکھر گئی اور میری بھوک دوگنی، چوگنی، سوگنی ہوگئی۔

اپنی آنکھوں میں ساری بھوک سمیٹ کر میں نے اس کی طرف بھرپور نظروں سے دیکھا تو اس نے مسکرا کر میری طرف یوں دیکھا جیسے اس نے میرے ان کہے بولوں کو سن لیا ہو۔ اپنا ہاتھ بڑھا کر اس نے اپنی نازک سی انگلیوں سے میری ہتھیلی کو ذرا سا چھوتے ہوئے اپنی چوڑی اٹھائی تو اس کے چھونے سے جیسے میں جی اٹھا۔ تازہ دم ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ تبھی اس کے ہونٹ ہلے اور وہ بولی:

''ڈھولا۔ بھوک لگی ہے تو تھوڑا صبر کرو۔ میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ سامنے دریا سے پانی بھر کر لاتی ہوں۔ پھر آ کر کھانا پکاؤں گی اور سوندھی سوندھی روٹیاں تمہیں کھلاؤں گی۔ جی بھر کر کھانا۔

میں دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس کے پیچھے چار نہیں، پانچ نہیں، کتنی ہی لڑکیاں سروں پر گھڑے اٹھائے دریا کی طرف جانے کے لیے تیار کھڑی تھیں۔

وہ جدھر کو مڑیں۔ میں نے دیکھا ادھر ہی چھل چھل کرتا دریا بہہ رہا تھا۔ ارے یہ دریا کہاں سے آ گیا۔ اس ٹیلے کے چاروں طرف تو چٹیل میدان تھا۔ اگر دریا پہلے سے تھا تو مجھے دکھائی کیوں نہیں دیا۔'' ابھی میں یہی سوچ رہا تھا کہ میرے کانوں میں اسی حسینہ کی آواز سنائی دی۔ وہ رُک کر پیچھے کی طرف پلٹ کر کہہ رہی تھی کہ ''میں گئی اور آئی۔ واپسی میں کنویں سے سبزیاں توڑ کر بھی لے آؤں گی۔ تمہارے لیے نیچے والے کھیت سے میتھی ضرور لاؤں گی۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہیں میتھی کی سبزی بہت پسند ہے۔''

وہ لڑکی یہ کہہ کر سہیلیوں کے ساتھ دریا کی طرف بڑھ گئی اور میں حیران ہو کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ میں جدھر بھی دیکھتا تھا ادھر ہی ہری بھری فصلیں لہلہا رہی تھیں، کسان کھیتوں میں کام کر رہے تھے، کہیں رہٹ چل رہا تھا، کہیں ہل کے آگے جتے بیلوں کے گلے کی گھنٹیاں فضا میں رس گھول رہی تھیں اور کہیں دور کسی چرواہے کی بنسری کی دھیمی سی دھن میرے کانوں تک ایسے پہنچ رہی تھی جیسے پرانی صدیاں مجھے آواز دے رہی ہوں اور چرواہا

کہہ رہا ہو کہ کھانا تیار ہو جائے تو مجھے آواز دے دینا۔ مجھے بھی بڑی بھوک لگی ہے۔'' یہ میرا خیال ہی نہیں بلکہ حقیقت تھی۔ بھوک صرف چرواہے کو ہی نہیں لگی تھی۔ صرف اسی نے بنسری کی دھن میں سمو کر یہ سندیسہ نہیں بھیجا تھا کہ اسے بھوک لگی ہے۔ بلکہ ہوا یوں کہ اس کی اس دھن کو سن کر سب کو پتہ چل گیا کہ بستی کی لڑکیاں گھڑے لے کر دریا کی طرف پانی لینے گئی ہیں۔ وہ پانی لینے گئی ہیں تو کھانا بنے گا ہی۔

اور اس کے ساتھ ہی کھیتوں میں کام کر رہے کسانوں کی بھوک جاگ گئی، ان کے ساتھ کام کرنے والے مزدوروں کی بھوک جاگ گئی۔ بستی کے تمام لوگوں کی بھوک جاگ گئی۔ ہر ایک آوازیں دینے لگا۔

مجھے بھی بھوک لگی ہے۔

مجھے بھی بھوک لگی ہے۔

کھانا میں بھی کھاؤں گا۔

''میں بھی..... میں بھی.....''

ان آوازوں کو سن کر لگتا تھا کہ ساری دُنیا کی بھوک جاگ گئی ہے۔

اور تو اور چرواہوں کی بھیڑ بکریوں کی میں میں کی آوازیں، کسانوں کے بیلوں بچھڑوں ان کی گائے بھینسوں تک کی آوازیں مجھ تک پہنچ رہی تھیں جیسے کہہ رہے ہوں کہ چارہ ان کو بھی چاہئے، بھوک ان کو بھی لگی ہے۔

یہ اتنے سارے لوگ کہاں سے آ گئے۔ ابھی تو ٹیلے کے چاروں طرف بالکل سناٹا تھا۔

اتنے میں لڑکیاں پانی بھر کر لوٹ آئیں تو میرا دھیان ان کی طرف چلا گیا۔ انہوں نے چولہوں میں آگ جلائی، تندور گرم کیے اور جب کھانے کی خوشبو چاروں طرف پھیلی تو کھانے کے لیے پوری دُنیا موجود تھی۔

ہاتھ آگے بڑھ رہے تھے۔

کھانے والے آتے جا رہے تھے۔

ہاتھ دوسرے ہاتھوں کو ہٹا رہے تھے۔

کھانے والے ایک دوسرے کو دھکیل رہے تھے۔

کچھ لوگوں نے آج کے لیے کھانا لے لیا تھا۔

دوسرے کل کے لیے، آنے والے کل کے لیے، کسی دور کے کل کے لیے جمع کرنے کی فکر میں تھے۔ بہت ایسے تھے جن کو اس وقت کے لیے بھی نہیں مل رہا تھا۔

باقی عورتیں کھانا پکا رہی تھیں۔ لیکن کٹیلی آنکھوں والی لڑکی اپنی چوڑی والی کلائی کو لہرا لہرا کر سب سے کہہ رہی تھی۔

دیکھو دریا پانی سے بھرا ہے۔

دیکھو کھیت اناج سے بھرے پڑے ہیں۔

یہ سب کی بھوک مٹا سکتے ہیں۔

کوئی بھوکا نہیں رہے گا۔

لیکن اس کی کون سنتا تھا۔ آپا دھاپی تھی۔ گالی گلوج تھی۔ پھر نوبت سر پھٹول تک آ گئی۔ نہ جانے کیسی کیسی بھوک تھی اور کتنی کہ وہ مرنے مارنے پر آمادہ ہو گئے۔ ہر سو لڑائی ہی لڑائی۔ ہر سو مہا بھارت سی جنگ۔

نتیجہ یہ نکلا کہ دیکھتے ہی دیکھتے دریا سوکھ گیا۔

دیکھتے ہی دیکھتے اناج سے بھرے کھیت اُجڑ گئے۔

دیکھتے ہی دیکھتے چولہے اور تندور سرد پڑ گئے۔

دیکھتے ہی دیکھتے آپس میں لڑتے لڑتے لوگ نیست و نابود ہو گئے۔

کٹیلی آنکھوں والی لڑکی بے بس سی ہو کر میرے پاس کھڑی ہو گئی۔ میں نے دیکھا۔ اس کی خوبصورت آنکھوں میں آنسو تھے۔

اس کے ماہتابی چہرے کی رنگت پیلی پڑ گئی تھی۔

اس کے ہونٹوں سے درد کی ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔

بستی کی اینٹ سے اینٹ بج گئی تھی۔ وہ ایک اجڑا ہوا ٹیلا بن کر رہ گئی تھی۔ اور اس سانحے کا تمام درد کٹیلی آنکھوں والی لڑکی کے وجود میں سما رہا تھا۔

تبھی کیکر کے نیچے والی درار چوڑی ہوئی اور کھانا بنانے والی تمام عورتیں آناً فاناً اس میں سما گئیں۔

کٹیلی آنکھوں والی لڑکی نے بھی میرے بازو کو تھاما اور درار کی طرف بڑھ گئی۔ چلتے ہوئے مجھے لگا کہ جیسے وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہو۔ مگر اس کے الفاظ ہونٹوں پر آ کر رُک رُک جاتے تھے۔ وہ کچھ کہہ نہیں پا رہی تھی۔

آخر وہ مجھے ساتھ لے کر درار تک پہنچ گئی اور پھر ایک جگہ رُک کر اس نے مجھے اپنے گلے سے لگایا، مسکراتے ہوئے میری آنکھوں میں جھانک کر دیکھا اور بولی:

''میں سبھی ٹیلے والوں کو ہزار مرتبہ کہتی ہوں کہ اپنی اپنی جگہ دفن پڑے رہو۔ ٹیلے کے اوپر جانے کی کوشش نہ کرو۔ لیکن میری کون سنتا ہے۔ لیکن..... لیکن..... میں دوسروں کو کیا کہوں میں تو خود ہر مرتبہ اپنی چوڑی درار کے پاس چھوڑ آتی ہوں کہ کوئی مجھے تلاش کرتا کرتا مجھ تک پہنچ جائے۔ اور.....

وہ ایک پل کے لیے رُکی۔ اپنی مسکراتی آنکھوں میں چھلک آئے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے بولی۔ ''ہماری حالت تو اس گلہری جیسی ہو رہی ہے ٹیلے پر اُگے کیکر کے کانٹوں میں الجھ کر لہولہان ہوتی رہتی ہے مگر ٹیلے کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاتی۔''

مجھے اس کی کلائی میں چوڑی نہیں دکھائی دے رہی تھی۔

○○○

دُکھ کے سُکھ

میری زندگی کی کلی ابھی پھول بن کر کھلی بھی نہیں تھی کہ اُس پر اولے پڑ گئے۔

ہوا یہ کہ والد بیمار رہتے تھے۔ اِس لیے بڑا بیٹا ہونے کی وجہ سے سارے خاندان کی دیکھ بھال، چھوٹے بھائی بہنوں کو پڑھانے لکھانے اور پالنے پوسنے کی ساری ذمے داری مجھ پر آن پڑی۔

والد چند سالوں سے بیمار چل رہے تھے۔ کچھ کمانے کے قابل تو تھے ہی نہیں۔ اُس پر بیمار ہوئے تو جو کچھ بچا کھچا تھا، سب گھر کے خرچوں اور مہنگی دوائیوں پر خرچ ہو چکا تھا۔

گھر میں میری دادی تھی، ماں تھی، چار چھوٹے بھائی بہن تھے۔ میری بیوہ بُوا تھی۔ کبھی کبھی میرے چچا کا بیٹا بھی آ جاتا تھا۔

اتنے لوگوں کے ہوتے ہوئے سب کے چہروں پر ایسی خاموشی چھائی رہتی تھی کہ لگتا تھا جیسے گھر بھائیں بھائیں کر رہا ہو۔ اِس خاموشی میں صِرف والد کی کھانسی کی آواز تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد گھر کی دیواروں سے ٹکراتی تھی تو ایسا لگتا تھا جیسے گھر کی دیواریں کانپ سی رہی ہوں۔ ہل سی رہی ہوں۔

ایسے میں ہم سب گھبرا کر چھت کی طرف دیکھنے لگتے تھے کہ کہیں اس زلزلے کے آنے سے نیچے تو نہیں گر رہی۔

اور پھر میں اپنے والد کی چھاتی پر اور ان کی پیٹھ پر ہاتھ ملتا ہوا ان کی سانس کی ٹوٹتی ہوئی لڑی کو جوڑنے کی کوشش کرنے لگتا تھا۔

ان حالات میں زندگی گزارنے کے لیے میں نے پہلا کام تو یہ کیا کہ دسویں کا امتحان

پاس کرنے کے بعد آگے پڑھنے کے اپنے سپنے کو ایک زنگ لگے پرانے سے بکسے میں بند کر کے تالا لگا کر گھر کے کسی ایسے کونے میں رکھ دیا جہاں اُسے کوئی دوسرا نہ دیکھ سکے، اور اِس کے بعد سوسوا سو روپے کی معمولی سی نوکری کر لی۔

پرانا زمانہ تھا۔ کسی طرح گھر کی گاڑی اٹک اٹک کر رینگنے لگی۔ یہ گاڑی کیسے چلتی رہی۔ اِس کا ذکر کرنے لگوں تو آپ کو میرے ساتھ پندرہ سال کا لمبا سفر کرنا پڑے گا۔

اِس سفر میں کتنے کانٹے چبھے، کس کس پڑاؤ پر میرا دم پھولا کتنی خاک چھانی، کن راہوں پر بھٹکا، یہ سب بتانے لگوں گا تو بات لمبی ہوتے ہوتے پتہ نہیں کتنی صدیوں پر پھیل جائے۔

وہ جو کہتے ہیں نہ کہ دُکھ کے پل بڑے لمبے ہوتے ہیں، بیتتے ہی نہیں۔ اِس لیے اِن پلوں کے درد کو اپنی جیب میں رکھ کر، اپنی آنکھوں میں چھلکے آنسوؤں کو اپنے ہی دل کے کٹورے میں بھر کر رکھتا ہوا بات کو آگے بڑھاتا ہوں۔

والد کی بیماری کا سلسلہ دس سال تک چلا۔ وہ بالکل ہڈیوں کا پنجر ہو کر رہ گئے تھے۔ پھر بھی اُن کی ذات اُس سوکھے پیڑ کے تنے جیسی تو تھی جس کے سائے کی پتلی سی لکیر اتنی تو ہوتی ہے کہ زندگی کی تپش سے راحت پانے کے لیے دو پل اُس کے نیچے کھڑا ہوا جا سکے۔

جب والد نے آخری سانس لی تو میں زندگی کے تپتے آسمان کے نیچے ٹنڈ، منڈ پیڑ کے پتلے سے سائے سے بھی محروم ہو گیا۔

اس عرصے میں میری شادی ہو چکی تھی۔ چار بچے بھی تھے۔ چھوٹے چھوٹے۔ لیکن میرے بھائی ابھی پڑھ رہے تھے۔ بہن بھی اسکول جاتی تھی۔ مہنگائی بڑھ چکی تھی۔ اِس لیے والد کی بیماری پر جو خرچہ اب نہیں ہو رہا تھا۔ اس سے بھی کوئی فرق نہ پڑا۔ اس لیے میری ہمت نہیں پڑتی تھی کہ زنگ شدہ بکسے میں، میں نے اپنے پڑھنے کا جو سپنا بند کر کے رکھا ہے۔ اُسے نکالوں، اُسے دیکھوں۔ اُسے پورا کرنے کی کوشش کروں۔

دل میں کانٹے سے چبھتے تھے۔ لیکن میری ہمت نہیں پڑتی تھی کہ اپنے سپنوں کے بکسے کو کھولوں۔

اِس طرح کچھ عرصہ اور آہیں بھرتے نکلا۔

اور پھر جب میرے چھوٹے بھائی، بہنوں کی تعلیم پوری ہوئی اور ایک کو اچھی نوکری بھی مل گئی تو میری عمر تیس کے پیٹے میں پہنچنے والی تھی۔

ایسے میں وہ تمام خوشیاں جن کو میں نے طاق پر رکھ دیا تھا، وہ مجھے آوازیں دینے لگیں۔ کہتی تھیں ہمیں بھی نیچے اُتارو، کھلی ہوا میں سانس لینے دو۔ ہمیں پھلنے پھولنے کا موقع دو۔ ہماری صحت اچھی ہوگی تو تمہارے چہرے پر بھی زندگی کی رنگت لوٹ آئے گی۔

اُنہوں نے زندگی کی رنگت کا نام لیا تو میں نے گھر میں ٹنگے میلے سے شیشے میں جھانک کر دیکھا۔ لگتا تھا جیسے لمبے عرصے کی پریشانیوں کی میل کی پرت نے شیشے کو نہیں میرے چہرے کو میلا کر رکھا تھا۔ اس میل کو دھونے کے لیے، اپنے چہرے کو صاف کرنے کے لیے میں نے زنگ شدہ بکسے سے اپنے آگے پڑھنے والے سپنے کو نکالا۔ وہ ہنستا ہوا باہر نکلا تو میں نے آگے پڑھنے کا بیڑا اُٹھایا۔ پڑھنے کے لیے صبح چھ بجے گھر سے نکلتا، دس بجے دفتر جاتا، شام کو کافی ہاؤس میں دوستوں کے ساتھ کچھ وقت گزارتا اور دیر رات گھر لوٹتا۔ اس طرح دسویں پاس کرنے کے پندرہ سال بعد جب میں نے بی۔ اے پاس کرلیا تو زندگی کی مصیبتوں نے اپنی ہار مان لی۔ مجھے اچھی نوکری مل گئی۔ تنخواہ اچھی ہوگئی اور اس طرح آہستہ آہستہ زندگی نے میرے لیے خوشیوں کے دروازے کھول دیئے۔

اب اتنے سال گزر جانے کے بعد جب پیچھے دیکھتا ہوں تو لگتا ہے کہ زندگی کے وہ سال جو میں نے اپنے والد کی خدمت میں گزارے تھے، اور زندگی کے وہ کڑے پل جو میں نے اپنے بھائی بہنوں کی زندگی سنوارنے میں گزارے تھے، وہی میری زندگی کا سرمایہ ہے، وہ مجھے ایسا سکھ دیتے ہیں، اتنا سکھ دیتے ہیں کہ ایسی زندگی ہزار بار گزارنے کو جی چاہتا ہے۔

اور جب میں اپنے والد کی تصویر کو گھر کی دیوار پر لٹکا ہوا دیکھتا ہوں تو والد کی خاموش دُعائیں لیتے ہوئے خود بخود یہ دوہا میری زبان پر آجاتا ہے۔

دِیوار کے اوپر ٹنگی ہے والد کی تصویر
مرنے پر بھی شرادھ میں مجھے کھلاتی کھیر

○○○

ایک ہے بوڑھ

ایک ہے بوڑھ۔

دُنیا بھر کی کالکھ جب گھنگور گھٹاؤں کا روپ دھار کر پورے آسمان میں پسر جاتی تو سرد ممالک سے آنے والی سفید کونجوں کی ڈاریں اپنے آپ کو اِس کالکھ کی بوچھار سے بچانے کے لیے اِس بوڑھ کو اپنا مسکن بنا لیتیں۔ کونجوں کی ڈاریں آتیں تو اِس بوڑھ کی تمام شاخیں بھر جاتیں اور یہ بوڑھ اچھی خاصی بڑی سی سفید چھتری بن جاتا۔

بڑی سی سفید چھتری جس کے نیچے آ کر تمام مخلوق خود کو محفوظ سمجھتی۔

یہ ہے اُس داستان کا لب لباب جو ہمارے ہاں ہر سال آنے والا میراثی ہمارے خاندان کی کلیان کرنے کے بعد سنایا کرتا۔ کلیان کرنے کا مطلب ہے، ہمارے خاندان کا شجرہ نسب سُنانا۔ فلاں کا بیٹا فلاں، فلاں کا فلاں۔ یہ سلسلہ بہت پیچھے تک جاتا ہے۔ پتہ نہیں کتنی نسلوں تک پتہ نہیں کتنی صدیوں تک۔ میراثی کہتا تو کچھ نہیں لیکن لگتا ہے کہ یہ کہانی سنا کر وہ ہمیں احساس دِلانا چاہتا ہے کہ دیکھو تم لوگ نسل در نسل اِس بوڑھ (برگد) کے نیچے بڑے سکون سے زندگی بسر کرتے رہے ہو۔

جس سال میراثی نے میرا نام اِس کلیان میں شامل کیا تب میری عمر چار پانچ سال کی تھی۔ اس کے مُنہ سے اپنا نام سُن کر مجھ پر نشہ سا طاری ہو گیا۔ مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ میرا نام لیا گیا ہے تو اِس کا مطلب ہے کہ دُنیا میں میرا شمار ٹھیک اِسی طرح کر لیا گیا ہے جس طرح کچی پہلی میں نام لکھنے کے بعد میرا شمار طالب علموں میں ہونے لگا تھا۔ اُس نشے کے عالم میں، میں بھاگا بھاگا پسار کے اندر گیا اور وہاں آلے میں رکھی اپنے باپ کی بندھی

بندھائی پگڑی سر پر رکھ کر باہر آیا تو سب کی نظریں میری طرف اُٹھ گئیں۔

میراثی دادو، میراثی دادو، میں کیسا لگتا ہوں۔'' میں نے پوچھا۔

''تم بالکل اپنے باپ سے لگتے ہو۔'' میرے باپ نے مجھے گلے سے لگاتے ہوئے کہا۔

''نہیں۔ یہ پورے کا پورا اپنے دادا پر گیا ہے۔'' میراثی دادو بولے، اور اپنی بات کی تائید کے لیے اُس نے میری دادی کی طرف دیکھا۔ میری دادی مجھے بٹ بٹ دیکھے جا رہی تھی اور حیران ہو رہی تھی۔ ''ہاں نہار بالکل انہی پر گیا ہے۔''

''مجھے یاد ہے۔ دادی نے یہ بات ایسے کہی تھی جیسے اپنے مرحوم شوہر کو اپنے سامنے دیکھ کر اُن کو لاج آ گئی ہو۔ پھر اُس نے پگڑی کو میرے سر سے اُتارا اور مجھے دیتے ہوئے بولی۔'' اِسے سنبھال کر وہیں رکھ آؤ جہاں سے لائے ہو۔ بڑے ہو جاؤ تب پہننا میرا بیباپُت۔''

میں پگڑی رکھ کر واپس آیا تو میراثی اپنی داستاں کو آگے بڑھاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''جب کونجیں زیادہ آ جاتیں تو وہ بوڑھ کے ساتھ والے پیڑوں پر بیٹھ جاتیں، اور ایسا لگتا جیسے بوڑھ کرشن بھگوان کی طرح وِشال روپ دھار کر دُنیا بھر کے گوال پال کو اپنی آغوش میں لے رہا ہو۔

''مجھے اِس کہانی میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ خود ہی اپنا دادا بن کر میں بڑا ہو گیا تھا۔ غالباً اس لیے اب بڑے ہو کر دادا کو بتانا چاہتا تھا کہ دیکھو میں تمہارے جتنا بڑا ہو گیا ہوں۔ اس لیے میں پھر میراثی دادا کے پاس گیا اور اُس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ باقی کی بات'' بعد میں سُنانا پہلے یہ بتاؤ کہ میرا دادا کہاں گیا ہے؟''

میراثی کے پاس اِس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ جواب ڈھونڈنے کے لیے اُس نے آسمان کی طرف دیکھا تو اتفاق سے اُس وقت کونجوں کی ایک ڈار ہمارے گھر کے اُوپر سے اُڑتی ہوئی جا رہی تھی۔ اُس نے اُن کونجوں کی طرف دیکھا اور کہا'' تمہارا دادا کونجوں کی اِس ڈار میں ہے۔''

یہ سُنتے ہی میری کلپنا کو پنکھ لگ گئے۔ میں نے کونجوں کے پاس جانے کا من بنالیا۔

''میں کونجوں کے پاس جاؤں تو اپنے دادا کو پہچانوں گا کیسے؟''

''تمہیں دیکھ کر جو کونج سب سے زیادہ ٹریں ٹریں کرے، وہی تمہارا دادا ہوگا۔''

میراثی نے میرے مسئلے کو حل کر دیا تو دوسرے ہی لمحے میں نے پرواز بھری اور کونجوں کی ڈار کے پاس پہنچ گیا۔ مجھے دیکھ کر سب کی سب کونجوں نے ایک ساتھ ٹریں ٹریں کرتے ہوئے مجھے اپنی ڈار میں شامل ہونے کا اشارہ کیا تو میں چکرا گیا۔ ''اِن میں میرا دادا کون ہے؟'' پھر میں نے دِل ہی دِل میں خود ہی اپنے شک کا سمادھان کرلیا۔

''جو کونج سب سے آگے ہے وہ میرے خاندان کا سب سے بڑا بزرگ ہے۔ اُس کے پیچھے والا اُس کے بعد والا بزرگ۔ یعنی میراثی اپنی کلیان میں جن کے نام لیتا ہے۔ وہ سب کے سب ڈار میں موجود ہیں۔

میں نے اُس ڈار میں شامل ہو کر سب کے پیچھے اُڑنا شروع کر دیا۔

اِس ڈار کے پیچھے اُڑتے ہوئے میں نے چاروں طرف نظر دوڑا کر دیکھا۔ آسمان کالے گھنگور بادلوں سے بھرا ہوا تھا۔ ڈار کے آگے سناٹا تھا۔ ڈار کے پیچھے سناٹا تھا۔ ڈار کے نیچے سناٹا تھا۔

ماضی میں اندھیرا
مستقبل میں اندھیرا

وقت کے اِس لمبے فاصلے کے بیچوں بیچ زندگی، کونجوں کی ڈار کی طرح رواں دواں۔

کونجوں کی ڈار
اور میں اِس ڈار کی ایک کونج۔
زندگی کے سفر کو آگے بڑھاتی ہوئی ننھی سی کونج
جیسے آسمان سے زمین پر اُترتی ہوئی سورج کی ایک کرن
اور میں اِس کرن کا ایک کن

کچھ ایسا ہی سوچتے سوچتے اِس سفر کو آگے بڑھاتے ہوئے میں اُس مستقبل میں بھی

پہنچ گیا جب میں ڈار کے سب سے آگے ہوں گا اور میرے پیچھے آ رہی ہوں گی میری نسلیں میرے پوتے، پوتیاں۔

اُن کے پوتے، پوتیاں۔

اُن کے پوتے، پوتیاں۔

اسی لیے کبھی میں اپنے بزرگوں کی ڈار کے سب کے پیچھے اُڑنے لگتا۔

کبھی اپنے بعد آنے والی نسلوں کے سب کے آگے۔

کبھی ماضی کی ڈار میں

کبھی مستقبل کی ڈار میں

میں اپنے تصور کی اِسی دُنیا میں گم تھا کہ تبھی پتہ نہیں بجلی کڑکی یا بادل گرجے، میرا دھیان ٹوٹا تو میراثی کی کہانی اُس منزل پر پہنچ رہی تھی جہاں وہ بتا رہا تھا کہ ایک بڑی بھیانک باڑھ آئی۔ باڑھ کے پانی نے پہلے بوڑھ کی جڑوں کو کھوکھلا کیا اور پھر اُس نے ایسی ٹکر ماری، ایسی ٹکر ماری کہ جیسے قیامت آ گئی ہو۔

وہ بوڑھ چھپاک کی آواز پیدا کرتا ہوا پانی کی تیز رولہروں میں گرا اور اُس کے ساتھ ہی بوڑھ کی شاخوں پر جی رہی ساری مخلوق، چڑیاں، کوّے، فاختائیں، گٹاریں، کبوتر، اُن کے گھونسلے گھونسلوں میں پڑے اُن کے انڈے، اُن کے بوٹ یہاں تک کہ بوڑھ پر پھدکتی رہنے والی گلہریاں، بوڑھ کی کھوہ میں رہنے والا سانپ سب کے سب پانی میں مِل کر پانی ہو گئے۔

داستاں کی اِس منزل پر پہنچ کر میراثی کی آواز میں اُداسی بھر گئی۔ اُس کے الفاظ گلے میں اٹک اٹک کر بہت دیر تک یوں بکھرتے رہے جیسے بوڑھ پر بسی زندگی کے پانی میں گرنے سے بلبلے بنتے ہیں پانی میں تیرتے ہیں اور پھر دو چار پل کے بعد ٹوٹ جاتے ہیں۔

میراثی نے اپنی کہانی کو جاری رکھتے ہوئے بتایا کہ یہ سانحہ کئی سال پہلے ہوا تھا۔ سال نہیں، دہائیاں۔ پتہ نہیں کتنی دہائیاں۔

اِس بیچ وہ کونجیں جو اپنے سفر کے دوران اِس بوڑھ پر آ کر بسیرا کیا کرتی تھیں وہ کب

کی ماضی کا حصہ بن گئیں۔کل کی بیتی ہوئی کہانی۔ بلکہ اُس کے بعد بھی کونجوں کی کئی نسلیں آئیں اور ماضی کا حصہ بن گئیں۔کل کی بیتی ہوئی کہانی۔

مگر..... اِس مگر تک آتے آتے میراثی کی آواز میں کچھ جان آ گئی۔ جیسے سوکھی مشک میں پانی بھر گیا ہو۔ وہ بڑی صاف آواز میں اپنی داستاں کو آگے بڑھا رہا تھا۔

کونجوں کی ڈاریں اب بھی آتی ہیں۔آگے بڑھنے سے پہلے وہ زمین کے اُس ٹکڑے کے اوپر جہاں کبھی وہ بوڑھ ہوا کرتا تھا، دو تین چکر ضرور لگاتی ہیں۔

وہاں چکر لگانے سے پتہ نہیں اُنہیں کیا ملتا ہے۔

بسیرے پر ٹھہرنے کا سُکھ۔

بسیرے پر ٹھہرنے کا سُکھ۔

سکون

یا آگے پرواز بھرنے کی طاقت

میراثی کی یہ داستاں تو خیر میرے بچپن کی کہانی ہے۔

اُس کہانی والا بوڑھ تو برسوں پہلے گر گیا تھا۔

لیکن میری لمبی عمر کے سفر میں وہ بوڑھ میرے تصور سے کبھی اوجھل نہیں ہو پایا۔ میں سوچنے لگتا کہوں کہ نہیں! وہ بوڑھ کبھی نہیں گرا۔ اور اگر میراثی کے بیان کے مطابق گرا بھی تھا تو وہ پھر اُسی جگہ اُگ آیا ہے۔

وہ اُسی طرح وہاں موجود ہے

کونجوں کی ڈاریں اُسی طرح آتی ہیں

اور اُس پر بسیرا کرتی ہیں تو وہ پھر سے سفید، چھتری بن جاتا ہے اور اُس پر بیٹھی کونجیں ٹریں ٹریں کرتی رہتی ہیں۔

ایک بار میں نے میراثی دادو سے پوچھا تھا ''وہ ہر بار ایک ہی کہانی کیوں سناتا ہے۔''

''کہانی تو بیٹے صرف ایک ہی ہے۔آدِ سے لے کر انت تک۔'' اُس نے کہا تھا۔

''ماضی سے مستقبل تک پھیلے کالے گھنگھور بادلوں کے درمیان زندگی کونجوں کی ڈار بن کر اڑتی رہتی ہے۔ سورج کی کرن کی طرح چمکتی رہتی ہے۔ آتی جاتی کونجیں ٹریں ٹریں کرتی رہتی ہیں۔ جانے والی کونجوں کی ٹریں ٹریں بند ہوتی ہے تو آنے والی کونجوں کی ٹریں ٹریں جاری رہتی ہے۔ اس طرح، ہر پل فنا ہو رہی زندگی لافانی ہوتی چلی جاتی ہے۔''

میں کچھ سمجھا تھا۔ کچھ نہیں سمجھا تھا۔ کچھ اور پوچھنا چاہتا تھا۔ لیکن تب تک میرا تائی دادو نے میرے گال کو تھپتپایا اور بولا۔ ''تم نئی کونج ہو۔ جاؤ ٹریں ٹریں کرو۔''

اور میں تب سے ٹریں ٹریں کر رہا ہوں۔

ooo

اصل غلطی

موت کے فرشتے سے اُس دن ایک روح کے قبض کرنے میں ایسی غلطی ہوگئی تھی کہ وہ ملکل الموت سے تو شرمندہ تھا ہی، اپنے آپ پر بھی اُسے کھیج آ رہی تھی۔

اُس سے ایسی غلطی اِس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی کہ مرنے والے بندے کے بجائے کسی دوسرے کی روح قبض کر لائے۔ اُس کی اِس غلطی کی وجہ سے ملک الموت کو اللہ میاں کے سامنے جواب دہی کرنی پڑی تھی۔ ایک آدمی کو وقت سے پہلے مار دیا گیا تھا اور دوسرا اپنی عمر کی معیاد پوری کرنے کے باوجود جیئے جا رہا تھا۔

اِسی لیے اُسے اپنے آپ پر غصہ آ رہا تھا، کھیج آ رہی تھی۔ ایسی غلطی آخر اُس سے ہو کیسے گئی۔ اُس کا اپنے آپ سے وِشواش اُٹھ رہا تھا۔

ظاہر ہے ایسے میں اُسے کچھ بھی اچھا نہیں لگ سکتا تھ۔

وہ جنت کی ایک نہایت خوبصورت جھیل کے کنار۔ ، بیٹھا تھا۔ موسم بہت ہی خوشگوار ہو رہا تھا۔ تبھی خوشبوؤں سے لدی ہوئی ہوا میں ہلکی سی حرکت ہوئی تو جھیل کی لہروں نے ناچتے ہوئے مدھم سُروں میں ایسا سرگم شروع کر دیا کہ کوئی اور موقع ہوتا تو فرشتے کے دِل و دِماغ پر سرور سا چھا جاتا۔ اُس کے سامنے بیٹھی ہوئی حور اپنی دلفریب اداؤں کے ساتھ فرشتے کو مشروبات اور لذیز چیزیں پیش کر رہی تھی۔ لیکن آدمی اندر سے خوش نہ ہو تو اُسے کوئی چیز اچھی نہیں لگتی۔

موت کے فرشتے کو ایسے لگ رہا تھا کہ وہ کسی تپتے ریگستان کے ٹیلے پر اکیلا بیٹھا ہو اور دور دور تک کہیں زندگی کا نام و نشان نہ ہو۔

سامنے بیٹھی ہوئی حور فرشتے کو بہلانے کے لیے اُس کا دِل خوش کرنے کے لیے مسکرا رہی تھی مگر فرشتے کا دِل رونا چاہ رہا تھا۔

حور نے جب دیکھا کہ فرشے کا دِل کسی طور نہیں بہل رہا تو وہ اُسے اُٹھا کر جھیل کی طرف اِشارہ کرنے لگی۔ ''اُٹھو، نہاؤ گے تو دِل بہل جائے گا۔''

فرشتہ بے دِلی سے اُٹھا۔ وہ کافی دیر تک جھیل کے پانی میں تیرتا رہا۔ حور بھی اُس کے ساتھ پانی میں اٹھکھیلیاں کرتی رہی۔ لیکن فرشتے کا من بجھے کا بجھا ہی رہا۔

آخر ہوا کیا ہے؟

حور کو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ دونوں جھیل سے باہر نکل آئے لیکن فرشتے کے دِل و دِماغ پر جو بوجھ تھا وہ کسی طور ہلکا نہ ہو سکا۔

فرشتے سے جو غلطی اُس دِن ہوئی تھی اُس کی داغ بیل تقریباً سو سوا سو سال پہلے پڑی تھی۔ ایک چھوٹا سا گاؤں ہے کوٹلی۔ اِس گاؤں میں مشکل سے بیس تیس گھر ہیں۔ اٹھارویں صدی کی آخری دہائی میں اِسی کوٹلی میں رہ رہے ایک آدمی کے ہاں گیارہ لڑکے پیدا ہوئے۔ وہ لڑکے جب بڑے ہوئے تو اُنہوں نے گھر میں جگہ کی کمی کو دیکھتے ہوئے گاؤں سے ایک آدھ فرلانگ ہٹ کر اپنی ہی زمین میں پانچ سات گھر بنوا لیے۔ انہوں نے سوچا ایک تو سب کے لیے رہنے کی سہولت ہو جائے گی۔ دوسرے کھیتوں کے قریب ہونے سے فصلوں کی دیکھ بھال اچھی طرح ہو جائے گی۔ وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ وہاں آٹھ دس گھر اور ہو گئے اور لوگ اُس بستی کو نئی کوٹلی کہنے لگے۔

سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا۔ لیکن ۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم ہوئی تو سرحد کی کانٹوں والی تار اُن دونوں بستیوں کے بیچ سے گزر گئی۔ ایک کوٹلی پاکستان کی طرف رہ گئی اور دوسری کوٹلی ہندوستان کے حصّے میں آئی۔

اب دونوں طرف کے گاؤں کوٹلی ہی کہلاتے تھے۔ نئی کوٹلی کو اب نئی کوٹلی کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہ گئی تھی۔

بس یہیں پر موت کا فرشتہ دھوکا کھا گیا۔ گاؤں کا نام تو ایک تھا ہی اب اِتفاق ایسا ہوا

کہ جس آدمی کی روح کو قبض کرنا تھا۔ اُسی نام اور اُسی ولدیت کے آدمی دونوں گاؤں میں موجود تھے۔ اور پھر یہ کہ دونوں گاؤں کا ایک سا ہی ماحول تھا ایک سی زبان، ایک سا پہناوا اور پھر خون کے رشتوں میں بندھے ہونے کی وجہ سے ایک سی شکل۔

''اسی لیے غلطی ہوگئی۔''

فرشتے کی زبانی سارا ماجرا سُن کر حور کھلکھلا کر ہنسی اور فرشتے کو دھکیلتی ہوئی اُس طرف لے چلی جہاں کھانے پینے کی چیزیں اُن کا انتظار کر رہی تھیں۔

وہ کہہ رہی تھی۔

فرشتے جی مہاراج۔ اِس میں آپ کو اتنا نادِم ہونے کی ضرورت نہیں۔ اصل غلطی آپ سے نہیں بلکہ..... اُن لوگوں سے ہوئی ہے جو اپنے گھر کے آنگن میں تقسیم کی کانٹے والی تار بچھانے کے لیے رضامند ہوگئے۔ وہ لوگ شاطر سوداگروں کی اِس چال کو سمجھ ہی نہیں پائے کہ تقسیم کی آگ میں یہ گھر جلتا رہے گا اور اِن کی آپس کی دشمنی میں ہمارا منافع کا کاروبار چلتا رہے گا۔

○○○

موت کا ڈر

اپنی طرف سے تو اس نے اسے جان سے مار ہی دیا تھا اور اس کے قتل کی سزا سے بچنے کے لیے وہ اپنے گاؤں سے روپوش ہوا تو سادھوں کی ایک ٹولی میں جا کر مل گیا۔ اس طرح بھگوے کپڑے پہنے اور اپنے گورو کی سیوا کرتے کرتے اس نے اپنی عمر کے چودہ سال گزار دیئے۔

سادھو بن کر وہ روز ہی نہانے کے بعد جب اپنے تن پر بھبھوت ملتا، ماتھے پر کیسر کی سیدھی تین لکیریں کھینچ کر بیچ میں لال رنگ کے سیندور کا تلک لگاتا تو اس کی آنکھوں کے سامنے مقتول کے سر سے بہتی ہوئی خون کی وہ دھار چمکنے لگتی جو اس کے ماتھے کے بیچ سے ہو کر اس کی ناک کے اوپر پھیل رہی تھی۔ اس نے ہزار کوشش کی کہ وہ خون کی لکیر اسے دکھائی نہ دے۔ اسے بھلانے کے لیے اس نے پرماتما کے نام سمرن کا سہارا لیا، یوگ کے کئی کرم کیے، اپنے گورو کے بتائے ہوئے راستے پر چل کر اسے نے اپنے من کو پوری یکسوئی کی کیفیت میں لے جا کر پرماتما سے دھیان جوڑنے کا ابھیاس کیا۔ لیکن اُسے کوئی خاص کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ خون کی لکیر جو اُس نے مرنے والے کے چہرے پر دیکھی تھی، ہزار روپ دھار کر اس کی آنکھوں کے سامنے پھیلنے لگتی۔ کبھی کبھی تو وہ یہ بھی دیکھتا کہ جیسے وہ ایک لال لکیر کئی چھوٹی بڑی لکیروں میں بٹ جاتی اور مقتول کے چہرے پر ان لکیروں کا ایک جال سا بچھ جاتا۔ اس طرح لال لکیروں کے جال سے بھرا وہ چہرہ جتنا بھیانک ہو جاتا اتنا ہی وہ اس کے لیے خوفناک بن جاتا۔

کہاں تو وہ پرتما کے نام کا سمرن کرتا ہوا پرماتما میں دھیان لگا کر سمادھی لگانے کی

کوشش کرتا اور کہاں ہوتا یہ کہ خوف کی لہر جیسے ہی اس کے دل میں پیدا ہوتی وہ لہر اس کے خون میں رچ بس کر سارے جسم میں دوڑ جاتی۔ اس کی روح تک لرز جاتی اور اس کے منہ سے اونچی آواز میں ''ہائے'' کا لفظ ادا ہو جاتا۔ اور وہ ٹھنڈے پسینے میں نہا جاتا۔

کئی بار تو ایسا بھی ہوتا کہ نہا کر، بھبھوت مل کر وہ دھونی کے پاس سمادھی لگانے کے لیے بیٹھنے ہی جا رہا ہوتا تو اُسے لگتا کہ مقتول کے چہرے پر پھیلتی خون کی لکیر، جیسے ایک چھینٹے کی شکل اختیار کر کے ہوا میں اُڑتی اور وہ ایسا محسوس کرتا کہ خون کے تمام چھینٹے اس کے اپنے چہرے پر آ گرے ہوں۔ اب خون آلود چہرے کے ساتھ وہ سمادھی پر تو بیٹھ نہیں سکتا تھا۔ ایسے موقعوں پر وہ ایک بار پھر نہاتا، پھر بھبھوت ملتا اور اس کے بعد ہی کہیں وہ ہمیشہ کی طرح سمرن کے لیے دھونی پر بیٹھ پاتا۔

اس طرح وقت آہستہ آہستہ گزرتا رہا اور چودہ سال کا لمبا عرصہ بیت گیا۔ اس عرصے میں اپنی پوجا بھگتی اور سیوا کے صدقے میں وہ اپنے گورو کا منظورِ نظر بن گیا تھا۔

اور پھر جب سادھوؤں کے اس ٹولے کے گورو کا آخری وقت قریب آیا تو اس نے سوا روپیہ اور ناریل اس کے قدموں پر رکھ کر اپنی گورو گدی اس قاتل کو بخش دی۔

گورو گدی مل جانے کے بعد اس کے ذمہ داریاں اور بڑھ گئی تھیں۔ اس کے ٹولے میں تقریباً سو سادھو تھے۔ سو سادھوں کو سادھو مارگ پر چلانے کے لیے اس کی مصروفیت بڑھ گئی۔ اب رات کے آخری پہر سے پہلے ہی اشنان کر کے اسے امرت بیلا سے ہی روز سمادھی پر بیٹھنا ہوتا تھا۔ پھر سادھوں کو گورو منتر دینا، گورو منتر کا جاپ کرانا، کتھا کیرتن وغیرہ تو معمول کے کام تھے ہی، اس کے علاوہ یہ بھی تھا کہ چیلوں کو الگ الگ کام سونپنے ہوتے تھے۔ کون بستی میں بھکشا لینے جائے گا، کون چولہے چوکے کے لیے ایندھن اور پانی کا بندوبست کرے گا۔ پھر وقت بے وقت بھگتوں کا تانتا لگا رہتا تھا۔ جس جس شہر یا گاؤں میں ان کا ڈیرا ہوتا، وہیں پر بھگتوں کی بھیڑ اُمڈ آتی۔ کسی بوڑھی کو گھٹنوں کے درد سے نجات چاہیے تو کوئی جوان عورت اولاد کی بھیک مانگ رہی ہے۔

وہ اپنے چیلوں کی مدد سے یہ سارے کام بڑی خوبی سے نپٹا رہا تھا۔ اس کے چیلے بھی

اس سے بہت خوش تھے اور اسے بڑا پہنچا ہوا سادھو مانتے تھے۔ لیکن دل ہی دل میں وہ یہ جانتا تھا کہ سارے تیرتھوں کے شنان کرنے اور سارے دیوی دیوتاؤں کے درشن کرنے اور گورو گدی کی اتنی مصروفیت کے باوجود اس کی آنکھوں کے سامنے اکثر پھیلنے والی وہ خون کی لکیر ابھی پھیکی نہیں پڑی تھی۔ اس کا رنگ ویسا ہی لال تھا اور وہ اکثر ایک چھینٹا سا بن کر اس کے چہرے پر پھیل جاتی تھی۔ ایسے موقعوں پر اُس کے دل میں خوف کی جولہر دوڑتی تھی، وہ اندر سے اسے کاٹتی ہوئی چیرتی ہوئی یوں نکل جاتی تھی جیسے نہ دکھائی دینے والی تلوار اس کے وجود کو کاٹتی چلی جا رہی ہو۔

اس دن شاید کوئی تیوہار تھا۔ سارے چیلوں کے علاوہ بھگتوں کی بھی بڑی بھیڑ اس کے درشنوں کے لیے اُمڈ پڑی تھی۔ آنکھیں بند کیے ہوئے پرماتما سے لو لگائے ہوئے وہ بھگوان شیو کی کوئی کتھا سنا رہا تھا۔ کتھا کیا تھی بھگتوں کو ایسا لگتا تھا جیسے خود وشنو بھگوان وہاں سادھو سنگت میں آ کر اپنی زندگی کے کسی واقعے کو پیش کر رہے ہوں۔ سب کے سب کتھا میں بیان ہو رہی زندگی کی کسی حقیقت میں کھوئے ہوئے تھے۔

کتھا سناتے سناتے گورو مہاراج نے اپنی آنکھیں کھولیں اور بھگتوں کا دل جیتنے کے لیے ان کے چہروں پر مہر کی نظر چاروں طرف دوڑائی تو ایک بھگت کے چہرے پر ان کی نظر جمی کی جمی رہ گئی۔

وہ تو وہی مقتول تھا جسے اپنی طرف سے قتل کر کے وہ چودہ سال پہلے بھاگے تھے اور پھر سادھو بن گئے تھے۔

کتھا سناتے سناتے انہوں نے سوچا۔ ''نہیں یہ وہ نہیں ہوگا۔'' اور انہوں نے دوسری طرف دیکھا۔ لیکن دل تھا کہ مانتا نہیں تھا۔ انہوں نے چوری چوری پھر اس آدمی کی طرف دیکھا۔ ''وہی ہے'' ان کی نظریں دھوکا نہیں کھا رہی تھیں۔

اسے پہچان کر پہلے تو ان کے دل پر پڑا ہوا بوجھ سا اتر گیا۔ انہوں نے کوئی قتل نہیں کیا تھا۔ ان سے قتل کرنے کا پاپ نہیں ہوا۔ پرماتما کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ وہ بچ گیا۔ لیکن پھر ان کے دل میں ایک خوف نے سر اٹھایا۔ یہ ضرور بدلہ لینے کی غرض سے مجھے ڈھونڈتا پھر رہا

ہوگا۔ یہ سوچ کر ان پر موت کا سایہ منڈلانے لگا۔ ان کا نورانی چہرہ پھیکا پڑ گیا۔ پیلا پڑ گیا۔ ان کا جسم پسینے سے شرابور ہو گیا اور دل بیٹھنے لگا۔ ان کی آواز جیسے گلے میں اٹک کر رہ گئی۔ ان کی کتھا وہیں پر رُک گئی۔

وہ کچھ دیر خاموش رہے۔ انہوں نے کوشش کی کہ اپنی کمزوری پر قابو پائیں اور بھگوان شوکی کتھا کو جاری رکھیں۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے چودہ سال کی اپنی بھگتی، تپسیا اور گیان کے سارے بھنڈار کو استعمال کرنے کی کوشش کی لیکن ان کے ذہن کی گاگر جیسے خالی ہوگئی تھی۔ ان کے منہ سے ایک لفظ بھی ادا نہیں ہو پا رہا تھا۔

آخر بڑی مشکل سے انہوں نے خود پر قابو پایا۔ صرف اتنا ہی کہہ پائے کہ باقی کی کتھا وہ اگلے دن سنائیں گے۔ اب اُن کی سمادھی کا وقت ہو گیا ہے۔

اسی شام وہ مقتول گورو مہاراج کے پاؤں پر آنسو ٹپکا رہا تھا۔

''اس میں کوئی شک نہیں کہ میں جگہ جگہ تمہاری تلاش میں ہمیشہ اسی لیے بھٹکتا رہا ہوں کہ اپنے قتل کا بدلہ لے سکوں۔''

یہ کہتے ہوئے اس نے کمانی والا چاقو جیب سے نکال کر اس کا بٹن دبا دیا تو اس کا چھ سات انچ لمبا تیز دھار والا پھل گورو مہارج کی آنکھوں کے سامنے چمکنے لگا۔

''لیکن آپ کو مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔'' اس نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ کی آنکھوں میں لہراتا ہوا موت کا ڈر، دل کی دھک دھک، چہرے کا اُڑا ہوا رنگ اور جسم کی کپکپی صاف ظاہر کر رہی ہے کہ چودہ سال کا سمرن، بھگتی، تپ اور تپسیا کے باوجود آپ میرے قتل کے آزار کو سہ نہیں پا رہے ہیں اور میں تو آپ جانتے ہیں کہ ایک عام آدمی ہوں۔ میرے لیے تو آپ کے قتل کے آزار کو سہنا اور بھی مشکل ہو جائے گا۔''

یہ کہتے ہوئے اس نے بٹن دبا کر چاقو کو بند کیا اور سامنے بہتے ہوئے دریا میں بہا دیا۔

○○○

تم تو جانتے ہو

''تم تو جانتے ہو''۔ اُس نے اپنی روداد کا آغاز ایسی اپنائیت سے کیا تھا جس سے اپنا پن چھلک رہا تھا۔

میں نے دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں بے بہا درد تھا۔ اِس درد نے اُس کی کنول سی آنکھوں کے گرد صف در صف ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ اور اُس کے ہونٹ اِس درد کو بیان کرنے کے لیے بے چینی سے یوں کھل رہے تھے، جیسے ازل سے اُنہیں میرا انتظار ہو۔

اُس سے میری ملاقات پاکستان میں ہوئی تھی، جہاں میں پہلی بار گیا تھا۔

ظاہر ہے۔ ہم ایک دوسرے کے لیے بالکل اجنبی تھے۔ لیکن پھر بھی ایسا لگ رہا تھا، جیسے ہم یگوں یگوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ یوں تو اُس ادبی جلسے میں تیس پینتیس لوگ موجود تھے، لیکن جب ہم آپس میں بات کرنے لگے تو ایسا محسوس ہوا جیسے وہاں اور کوئی نہیں ہے۔ صرف ہم دونوں ہیں۔ اسی لیے تو ہم دونوں کے درمیان کھل کر دِل سے دِل کی بات ہو رہی تھی۔ پھر اُس کی ہونٹ ہلے تو ایسا لگا جیسے درد کے مارے اُس کے الفاظ کراہتے ہوئے اپنا فرض پورا کر رہے ہوں۔

''میری آنکھ سے آنسو ٹپکا اور وہ موتی بن گیا۔''

''وہ اپنی زندگی کی کوئی پانچ چھ ہزار سال پرانی بات بتا رہی تھی۔ کہنے لگی۔ ''تم تو جانتے ہو تب میں جنگل میں رہتی تھی۔ ایک بار ایسا ہوا کہ میں نے ہرن کو تیر مارا۔ تیر ٹھیک نشانے پر لگا۔ ہرن وہیں ڈھیر ہو گیا۔ لیکن جب میں اپنے شکار کے پاس پہنچی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ ایک اور نوجوان اُس ہرن کو اپنا شکار سمجھ کر اُس کی طرف بڑھ رہا تھا۔

اور یہ بات ایک طرح سے ٹھیک بھی تھی۔ دراصل ایک ہی وقت میں ہم دونوں کے تیر اُس ہرن کو لگے تھے۔ ایک دائیں طرف سے دوسرا بائیں طرف سے۔

کوئی اور موقع ہوتا تو ہم دونوں میں جم کر لڑائی ہوتی۔ یہ لڑائی تیروں سے بھی ہو سکتی تھی اور ہاتھا پائی سے بھی۔ اگر پتھر قریب ہوتے تو ہم ایک دوسرے کو پتھر بھی مارتے۔ جو جیت جاتا، وہ شکار لے جاتا۔

یہ ہونے بھی جا رہا تھے۔ کیونکہ جیسے ہی ہم نے ایک دوسرے کو ہرن کی طرف بڑھتے دیکھا، ویسے ہی، تم تو جانتے ہو، ہم نے اپنے تیر کمان پر چڑھا لیے۔ لیکن پھر پتہ نہیں ہم نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں کیا دیکھا کہ تیر چلانے کے لیے کھینچے ہوئے ہم دونوں کے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے اور ہم ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ہرن کے پاس پہنچے۔

تم تو جانتے ہو۔ ہم دونوں کے ہونٹ نہیں ملے تھے۔ لیکن ہماری آنکھیں یقیناً کچھ بولے بغیر، کچھ ایسا ہی کہہ رہی تھیں جیسا ہیر نے اپنی ناؤ میں بچھے پلنگ پر رانجھے کو سوتے ہوئے دیکھ کر کہا تھا کہ "اچھا ہوا، میں تمہیں نہ مار بیٹھی۔"

غرضیکہ ہمارے بیچ لڑائی تو ہوئی بقول وارث شاہ چار چشموں کے بیچ گھمسان کی لڑائی تھی جس میں ہم دونوں اپنا آپ ایک دوسرے کے لیے ہار چکے تھے۔

اور تم تو جانتے ہو کہ "پیار کے لیے ایک دوسرے کے سامنے ہارنے میں دونوں کی جیت ہوئی تھی"

وہ بڑے پیار سے سوکھی لکڑیاں کاٹ کر لایا تھا۔

میں نے بڑے پیار سے آگ جلائی۔

ہم دونوں نے بڑے پیار سے ہرن کے گوشت کو بھونا۔

ہم نے بڑے پیار سے ایک ایک بوٹی توڑ کر ایک دوجے کو کھلائی۔

ایسا کرتے ہوئے جب میری انگلیاں اُس کے ہونٹوں سے چھوتیں تو میرے جسم میں پیار کی ترنگ دوڑ جاتی اور اس طرح مجھ پر نشہ سا طاری ہو گیا۔

ابھی اُس نشے سے میں پوری طرح سرشار بھی نہ ہو پائی تھی کہ سارا نشہ ہرن ہو گیا۔

'تم تو جانتے ہو۔ ہوا یہ کہ ایک اور لڑکی جو اس کی پہلی محبوبہ تھی اُسے ڈھونڈتی ڈھونڈتی آئی اور اُس نوجوان کو بازو سے پکڑ کر یوں گھسیٹ کر لے گئی جیسے وہ اس کے لیے چھوٹا سا کھلونا ہو۔

جب وہ اُسے مجھ سے دور لیے جا رہی تھی تو ایک بار تو میرے ہاتھ تیر کمان کی طرف گئے لیکن پھر یہ سوچ کر میں نے خود پر قابو پا لیا کہ اگر تیر غلطی سے اُس نوجوان کو لگا تو اُس سے میرے دِل کا بھی خون ہو جائے گا۔

یوں میرے دِل کا خون تو ہو ہی گیا تھا۔

اُس دِن میں بھوکی ہی رہ گئی۔ پیار کی بھوکی۔

اور پھر تم تو جانتے ہو، میرے دل کا درد آنسو بن کر آنکھ سے بہہ نکلا اور میں نے دیکھا کہ میرا آنسو زمین پر گرا اور موتی بن گیا۔

''ایک بار اور ایسا ہوا'' وہ مجھے بتا رہی تھی۔

''تم تو جانتے ہو۔ تب میں ایک مہارِشی کی بیٹی تھی۔ اور ایک گھنے جنگل میں اُس کے آشرم میں رہتی تھی۔ اُس آشرم کے ساتھ ایک گوروکل بھی تھا، جس میں کچھ وِدیارتھی رِشی مہاراج سے ویدوں کی وِدیا پڑھتے تھے۔

گوروکل کے پاس ایک بگیا بھی تھی، جہاں میں ہر روز صبح کو اپنے ہارشنگار کے لیے پھول توڑنے جایا کرتی تھی۔ اُسی بگیا میں، ایک وِدیارتھی نے کچھ دِن بعد آنا شروع کیا۔ اُس کا کام تھا، گورو مہاراج کی پوجا ارچنا کے لیے پھول اِکٹھے کرنا۔

'تم تو جانتے ہو۔ پہلے پہل میں نے اُس کی طرف زیادہ دھیان نہیں دیا۔ وہ اپنے دھیان پھول توڑتا اور میں اپنے لیے۔ لیکن کچھ دِن بعد مجھے ایسا لگا جیسے اُس کی بھولی بھالی صورت میرے دِل میں اُترتی جا رہی ہو۔ اپنی کٹیا میں جا کر جب میں اپنے لیے پھولوں کے زیور تیار کرتی تو مجھے ایسا لگتا کہ اُس کا چہرہ پھول کا روپ دھار کر میرے ہاتھوں میں مہک رہا ہو۔ میں ہاتھ میں پکڑے ہوئے پھول کو چوم لیتی۔ ایسا کرتے ہوئے میرا اپنا چہرہ پھول کی طرح کِھل اُٹھتا۔

کچھ دِن بعد میں نے دیکھا کہ بگیا میں مجھے دیکھتے ہی اُس کا وجود بھی پھول کا بن جاتا اور میں اُس کی خوشبو کو اپنے دِل میں بسا لیتی۔

اِس طرح ہم دونوں کا پیار ہمارے وجود میں رس بس گیا اور ہم نے ایک ساتھ زندگی گزارنے کے لیے عہد و پیمان کر لیے۔

لیکن پھر یہ ہوا کہ ایک دِن ایک راج کمار ہمارے آشرم میں آیا اور اُس نے رِشی مہاراج سے میرا ہاتھ مانگ لیا۔

تم تو جانتے ہو کہ جس روز میری ڈولی راج کمار کے گھوڑے کے پیچھے پیچھے جا رہی تھی، اُس دِن میں اپنے محبوب کو یاد کر کے ڈولی کے ریشمی پردوں کے پیچھے روتی رہی اور میرے سارے آنسو جو اُس ڈولی میں گرے، موتی بن گئے۔

راج محل میں پہنچ کر راج کمار نے جب میری ڈولی میں بہت سے انمول موتی دیکھے تو وہ حیران رہ گیا کہ رِشی مہارج کے پاس جہیز میں دینے کے لیے اتنے موتی کہاں سے آئے۔

اپنی بات کرتے کرتے میرے پاس بیٹھی ہوئی وہ عورت اُداس ہو گئی اور کہنے لگی ''یہ باتیں تو اب محض کہانیاں بن کر رہ گئی ہیں۔ بلکہ مجھے تو لگتا ہے کہ یہ واقعات، روپ بدل بدل کر میری زندگی میں ازل سے ہوتے آئے ہیں۔ کبھی کچھ ہو جاتا ہے، کبھی کچھ اور میری رُوح پیاسی کی پیاسی رہ جاتی ہے۔

'تم تو جانتے ہو۔ میں پانچ دریاؤں کی پٹرانی ہوں۔ اور پھر بھی ازل سے پیاسی ہوں۔''

حقیقی زندگی کی بات چھوڑو۔ میرے تو سپنوں میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ ابھی کل رات کی بات ہے۔ میں نے دیکھا کہ ایک بہت بڑا دریا ہے۔ میلوں چوڑا اُس کا پاٹ اور بڑا تیز اُس کا بہاؤ۔ اور میں ایک ناؤ میں سوار اُس بہاؤ میں بہتی جا رہی ہوں۔ پھر میں نے دیکھا کہ دوسرے کنارے سے ایک اور ناؤ میری ناؤ کے نزدیک آ رہی ہے۔ غور سے دیکھنے پر کبھی اُس ناؤ کا سوار مجھے جنگل والے لڑکے جیسا لگتا اور کبھی وہ آشرم والا وِدیارتھی۔

جیسے جیسے ہماری ناؤیں نزدیک آ رہی تھیں، ویسے ویسے ہم ایک دوسرے کو پہچاننے کی

کوشش کر رہے تھے۔ اور ہم نے ایک 'دوسرے کو پہچان بھی لیا۔ یگوں بعد ایک 'دوسرے سے ملن کی خوشی کلی بن کر ابھی ہمارے دلوں میں کھل بھی نہیں پائی تھی کہ ہم نے دیکھا کہ اُس مقام پر وہ دریا دو پھاڑ ہو گیا۔

ایک حصّہ 'مجھے بہالے گیا۔ ایک طرف

ایک حصّہ اُسے بہالے گیا۔ دوسری طرف

اور ہم ایک مرتبہ پھر ایک دوسرے سے دور چلے گئے۔'

یہ بات کرتے کرتے اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور بولی۔ میں تو اپنی بات ہی کہتی چلی گئی۔' کچھ تم بھی تو کہو۔

اور جب میں نے اپنی آپ بیتی سنائی تو اُسے لگا جیسے یہ بھی اُس کی اپنی آپ بیتی تھی۔ ایک سے لفظ ایک سی داستاں۔

اُس کے دِل کا پیالہ جو اپنی درد کہانی بیان کرتا کرتا بھر آیا تھا، اب چھلک اُٹھا اور ایک آنسو اُس کی پلک پر آ کر ٹھہر گیا۔

اِس سے پہلے کہ وہ آنسو زمین پر گر کر مٹی میں جذب ہو جائے، میں نے اُس دولت کو اپنے رومال میں سمیٹ کر کوٹ کی جیب میں رکھ لیا۔

اگلے روز مجھے لاہور سے ہندوستان آنا تھا۔

پاکستانی کسٹم والوں نے مجھ سے پوچھا تو میں نے کہا کہ میں تو پاکستان سے دوستوں کی دی ہوئی کتابیں ہی لیے جا رہا ہوں۔ کوئی ناجائز چیز میرے پاس نہیں ہے۔ کسٹم آفیسر نے میری سفید داڑھی دیکھ کر مجھ پر یقین بھی کر لیا، لیکن پھر بھی اپنا فرض پورا کرنے کے لیے اس نے اپنا آلہ میرے گِرد گھمایا اور میرے کوٹ کی جیب پر آتے آتے جب آلہ سے کوئی مخصوص آواز پیدا ہوئی تو کسٹم والے کا چہرہ سخت ہو گیا۔

''کوٹ کی جیب میں کیا ہے؟'' اُس نے سخت آواز میں پوچھا

میں نے بتایا نہ کہ کچھ بھی نہیں

دوسرے ہی لمحے اُس نے میری جیب میں ہاتھ ڈالا اور رومال میں لپٹا ہوا موتی مجھے

دِکھاتے ہوئے بولا۔ ''اور یہ کیا ہے؟''

موتی دیکھ کر میں خود حیران رہ گیا۔ لیکن فوراً سارا ماجرا میری آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔

''میں نے کہا۔'' یہ تو اُس عورت کی آنکھ سے ٹپکا ہوا آنسو ہے جو..... رشی کے آشرم میں رہتی ہوئی اپنے محبوب سے بچھڑ گئی تھی۔ یہ تو اُس کے پیار کی نشانی ہے۔

کیا آپ سے وہ عورت ملی تھی جس کا تکیہ کلام ہے ''تم تو جانتے ہو اور جو ہزاروں سال پہلے اپنے محبوب سے بچھڑنے کی داستان سُنایا کرتی ہے،'' کسٹم آفیسر نے کہا اور موتی میری جیب میں رکھ دیا۔ ''اِس عورت کے پیار میں ہماری ساری قوم کا پیار چھلک رہا ہے۔ آپ کے لیے اور ہندوستان کے لیے۔'' یہ کہتے ہوئے اُس نے بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملایا اور مجھے جانے کی اجازت دے دی۔

پیار کی یہ نشانی ہندوستان لاتے ہوئے میری خوشی ایک گیت میں ڈھل گئی جس کے بول تھے۔

وارث شاہ بھی ہنس رہا تھا۔
بھاگ بھری کو بتا رہا تھا۔
میرے سپنے پورے ہو گئے ہیں۔
ہیر اور رانجھا ایک ہو گئے ہیں۔

○○○

سوالیہ نشان

میں ایک واقعہ بیان کر رہا ہوں۔ واقعہ جس کو وقت، نصف صدی سے بھی زیادہ عرصے تک اپنے دوش پر سوار کر کے کسی طور اپنے سفر پر گامزن رہا۔ لیکن جب وقت کے کندھے تھک گئے اور اس کے لیے اس کا بھاری بوجھ اُٹھا کر چلنا دشوار ہو گیا تو اس نے ایک رات اسے میرے کمرے میں اس وقت پٹخ دیا جب میں گہری نیند سویا ہوا تھا۔

میرے کانوں میں کُتے کے زور زور سے بھونکنے کی آواز سُنائی دی تھی اور میں بھونچکا سا جاگ گیا تھا۔ آنکھیں ملتے ہوئے میں نے دیکھا، وقت اپنے بوجھ کو میرے پاس پھینک کر اپنا کندھا سہلاتا ہوا کمرے سے باہر جا رہا تھا۔

''اپنی گٹھری کو میرے کمرے میں چھوڑ کر کہاں جا رہے ہو۔'' میں وقت سے پوچھنا چاہتا تھا۔ اسی مقصد سے میں اس کے پیچھے لپکا تو اس واقعے نے میرے قدموں کو جکڑ لیا اور بولا:

''وقت کے پاس تو میں صرف امانت کے طور پر محفوظ تھا۔ بوجھ تو میں تمہارا ہوں۔ تمہیں اُٹھانا پڑے گا۔''

''میرا بوجھ؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے واقعے کی طرف دیکھا۔

''گھبراؤ نہیں صرف تمہارا نہیں تمہارے عہد کے تمام لوگوں کا۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ میں ان تمام نسلوں کا بھی بوجھ ہوں جو میرے رونما ہونے سے پہلے زندگی کے سفر کی کڑی تھیں اور مستقبل کو کون جانتا ہے ممکن ہے مجھے آنے والی نسلوں کا بھی.....''

اُس کے یہ الفاظ سُن کر میری رُوح کانپ گئی۔ اس کی بات کے رمز کو سمجھنے کے لیے

میں نے سوچا، واقعے کی گٹھری کو کھول کر دیکھوں۔

گٹھری کو ہاتھ لگایا تو کتا پھر بھونکنے لگا، جس کی آواز نے آدھی رات کو جگا کر مجھے اس واقعہ سے دوچار کیا تھا۔

کُتا بھونکے جا رہا تھا۔ گٹھری کے سامان کو دیکھ دیکھ کر بکھرے ہوئے واقعات کی کڑی کو میں جس قدر جوڑتا تھا اتنا ہی میرے کندھوں پر بوجھ بھاری ہوتا جاتا تھا۔ اپنے بوجھ کو ہلکا کرنے کے لیے گٹھری کے سامان کی تفصیل میں جائے بغیر میں سیدھا واقعے کی طرف آتا ہوں۔

بات اس صدی کی ہے.....

لیکن یہ کُتا بھونکے جا رہا ہے۔ شاید یہ چاہتا ہے کہ واقعے کے ساتھ ساتھ اس کے بھونکنے کی آواز بھی قاری یا سننے والے کے کانوں تک پہنچے۔ بہر حال میں واقعہ سُناتا ہوں۔ کتا بھونکتا ہے تو بھونکنے دیجئے۔ اس واقعے کو سننے کے لیے آپ کو کتے کی آواز کو برداشت کرنا ہوگا۔

ہاں تو بات اُس صدی کی ہے جب بان سے بُنی گئی چارپائی کی رسّیوں کی طرح مل جل کر رہنے والے لوگ دو حصّوں میں بٹ گئے۔ چارپائی کے پایوں کی چولیں ڈھیلی ہوگئیں۔ باہیاں اور سیرو الگ الگ ہوگئے۔ بان کی رسّیاں تڑ تڑ ٹوٹنے لگیں، اور اس چارپائی پر سج سنور کر بیٹھی ہوئی زندگی اوندھے منھ زمین پر گر پڑی اور درد کے مارے کراہ اُٹھی۔ اُس کے کراہنے میں ان تمام ماؤں، بہنوں، بہوؤں بیٹیوں کی چیخیں شامل تھیں جن کی عصمت لوٹی گئی تھی۔ ان ہزاروں بے گناہ لوگوں کی حسرت شامل تھی جن کا قتل ہوا تھا۔ ان لاکھوں لوگوں کے لہو سے سینچے ہوئے آنسو شامل تھے جنھیں اپنے آبائی گھروں کو چھوڑ کر نئے علاقوں میں جا کر بسنے کے لیے مجبور کیا گیا تھا۔ آبادی کا یہ تبادلہ اتنا بڑا تھا کہ شاید ہستی کے وجود میں آنے سے لے کر اتنی بڑی تعداد میں لوگ کبھی نہیں اُجڑے تھے اور یہ سب اس لیے ہوا تھا کیوں کہ بان سے بُنی چارپائی کی رسّیوں کا جب آپس میں رشتہ ٹوٹا تو چارپائی کے ٹکڑے تو ہوئے ہی ایک ملک کے بھی.....

ہاں، تو بات انہی دنوں کی ہے۔ تب ایک ملک سے دوسرے ملک میں بھیجے جانے والے لوگوں کو اپنے ہی شہر میں قائم کیے گئے کیمپوں میں رکھا جاتا تھا۔ ان کیمپوں کی زندگی مرغی کے ڈربوں جیسی تھی۔ ان ڈربوں کے باہر بلّیاں بلّے تو کُجا، اگر مٹی کی بنی ہوئی بلّی بھی کسی کو دکھائی دے جاتی تھی یا بلّی ہونے کا شک گزر جاتا تھا تو ڈربے میں بند مرغیوں کی جان سہم کر سُوکھ جاتی تھی آپ اِسے ات کھتنی نہ سمجھیں تو میں کہہ دوں کہ باہر گیدڑ کی آواز سُن کر کیمپوں میں بند شیروں کا دم خشک ہو جاتا تھا۔ ان باتوں سے آپ کو صرف یہ احساس دلانا مقصد ہے کہ ان کیمپوں کے باہر کتنے خطرے ہر وقت منڈلاتے رہتے تھے۔

ایسے میں یہ ہوا کہ ایک آدمی کے باپ پر دل کا دورہ پڑا۔ کیمپ میں علاج کے لیے کوئی سہولت نہیں تھی، نہ ہی مریض کو کسی اسپتال میں پہنچانے کا انتظام تھا، ایسے میں مریض کو خود ہی خیال آیا اور اس نے اپنے دل کے درد پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بیٹے کو بتایا کہ اپنے گھر کی فلاں الماری میں ڈاکٹر کی دی ہوئی تمام دوائیاں موجود ہیں جو ایسے خطرے کو وقتی طور پر ٹال سکتی ہیں۔ ممکن ہے عارضی راحت بھی مل جائے۔

یہاں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ جانے یا نہ جانے کے پس وپیش میں ضائع کرنے کے لیے بیٹے کے پاس وقت نہیں تھا۔

ایک بار میں کیمپ سے باہر نکل جاؤں تو باہر کون پہچانے گا کہ میں کون ہوں، اور اگر اپنی گلی تک پہنچ گیا، تو پھر تو فکر کی کوئی بات ہی نہیں۔

ہوا بھی ایسا ہی۔ جیسا اس نے سوچا تھا۔ راستے میں کسی نے نہیں پہچانا کہ وہ غیر ہے اور جب وہ اپنی گلی میں پہنچا تو اسے تقویت ملی۔ گلی کے موڑ پر ڈبو کتے نے اسے پہچان لیا اور وہ دُم ہلاتا ہوا اس کے قدموں سے لپٹ گیا۔

اس وقت دن کی بچی بچائی روشنی جلدی جلدی رات کے اندھیرے کی چادر اوڑھ رہی تھی، اس لیے گلی میں روشنی بھی تھی اور اندھیرا بھی۔ روشنی کچھ کم اور اندھیرا کچھ زیادہ۔ اپنے گھر کا دروازہ کھولتے ہوئے اسے صرف اللہ رکھی نے دیکھا۔ اس اللہ رکھی کا ایک نام رام رکھی بھی ہے، اور وہ اپنے پڑوسیوں کو چاہے وہ کسی بھی مذہب کے ہوں، اپنے بنائے

ہوئے کباب یا پکوڑے ضرور کھلاتی تھی۔ اس نے اللہ رکھی یا رام رکھی کی طرف دیکھا اور نہایت دبی زبان میں صرف اتنا کہا:

''والد صاحب کو دورہ پڑا ہے۔ ان کی دوائی لینے آیا ہوں۔''

جیسے ہوا کا جھونکا جائے اور پھر فوراً ہی پلٹ آئے۔ وہ آدمی ہوا کا جھونکا بن کے گھر میں داخل ہوا، دوائی سمیٹی اور دوسرے ہی پل باہر آ گیا۔

واپس ہوتے ہوئے اس نے سوچا کہ اگر اللہ رکھی عرف رام رکھی اسے کباب یا پکوڑے دے گی تو وہ گھر والوں کے لیے لے جائے گا۔ کیمپ میں ایسی لذیذ چیزیں کھانے کو جی ترس گیا تھا۔

لیکن جب وہ واپس لوٹا تو اس نے دیکھا کہ اللہ رکھی عرف رام رکھی کی نظریں سہمی ہوئی تھیں۔ گلی میں کوئی نہیں تھا۔ شاید وہ اپنی گلی کی دیواروں سے خوف کھا رہی تھی، اور چاہتی تھی کہ اُس کا وہ پڑوسی جسے وہ اس وقت کباب یا پکوڑے نہیں کھلا پا رہی تھی وہ مُرغیوں کے ڈربے والے کیمپ میں خیریت سے پہنچ جائے۔ ممکن ہے وہ دل ہی دل میں بیمار پڑوسی کی صحت یابی کے لیے اللہ یا رام سے دُعا گو ہو۔

ابھی اللہ رکھی عرف رام رکھی کی دُعا ختم بھی نہ ہو پائی تھی کہ وہ آدمی گلی کے آخری سرے پر پہنچ گیا۔ وہاں سے وہ بڑی سڑک کی طرف مُڑنے ہی والا تھا کہ تبھی اللہ رکھی عرف رام رکھی کی چیخ نکل گئی۔ محلے کے کسی آدمی نے کیمپ سے آنے والے آدمی پر تلوار سے وار کیا تھا۔

''لیکن وہ آدمی بچ گیا۔''

میرے پاس کھڑا وقت وہ واقعہ مجھے بتا رہا تھا۔

''یہ کتا بھونکتے ہوئے، تلوار کا وار کرنے والے کو کاٹنے کے لیے دوڑا، اس لیے اپنا بچاؤ کرنے کی کوشش میں اس کا وار خالی چلا گیا۔''

وقت اُس کتے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے، مجھے بتا رہا تھا۔ جس نے آدھی رات کو مجھے گہری نیند سے جگایا تھا۔

میں نے بڑے پیار سے کتے کی طرف دیکھتے ہوئے وقت سے پوچھا۔ ''یہ تو بڑی اچھی بات ہے کہ اس نے اپنی گلی میں رہنے والے آدمی کی جان بچائی۔ لیکن اب یہ ہر وقت بھونکتا کیوں رہتا ہے؟''

''جب تک یہ بھونکتا رہے گا تب تک کوئی آدمی دوسرے آدمی پر قاتلانہ حملہ نہیں کرے گا۔ ایسا یہ سوچتا ہے۔'' وقت کا جواب تھا۔

پھر میری نظر بان کی بُنی چارپائی کی طرف گئی۔ اُس کے دو ٹکڑے ہو چکے تھے لیکن بان کی کچھ رسّیاں ابھی ٹوٹی نہیں تھیں اور وہ چارپائی کے دونوں ٹکڑوں کو اب بھی باندھے ہوئے تھیں — اِن نہ ٹوٹنے والی رسیوں کے بیچ کھڑی اللہ رکھی عُرف رام رکھی سوالیہ نشان بنی کبھی میری طرف دیکھتی ہے کبھی ماضی اور مستقبل کی حدوں کی طرف۔

○○○

خطرہ

لیسا اپنی بھیڑوں کو چرنے کے لیے چھوڑنے کے بعد اپنے کنوارے پن کی پوری آب وتاب کے ساتھ مخصوص ڈھلان پر آ کر بیٹھتی ہے تو اس کے نوخیز چہرے پر زندگی — تمام رعنائیوں کے ساتھ چمک رہی ہوتی ہے لیکن اُس دن دو رات پہلے دیکھا سپنا، ڈر بن کر اس کے دل میں کہیں سانپ کی طرح کنڈلی مار کر بیٹھا تھا۔

وہ بڑے سکون سے اس چٹان کی طرف بڑھ رہی تھی جس کے اوپر پہاڑ کی سب سے اونچی چوٹی نیلے آسمان کی طرح چھتری بن کر پھیلی رہتی ہے۔ تبھی دل کے اندر بیٹھے اس سانپ نے چپکے سے سر اُٹھالیا۔ لیسا نے ڈرتے ڈرتے چٹان کی طرف دیکھا۔ اسے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ اس کی چٹان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ وہ کنول پھول کے سانچے میں نہیں ڈھلی ہے اور اس کے ساتھ ٹھاٹھیں مارتا ہوا کوئی دریا نہیں بہہ رہا ہے۔

''پہاڑ کی اس بلندی پر دریا کہاں سے آئے گا۔'' اپنے اس بے بنیاد ڈر پر وہ خود ہی مسکرادی اور بڑے آرام سے چوکڑی مار کر چٹان پر بیٹھ گئی۔

سپنے میں اس نے یہ دیکھا تھا کہ ایک ادھیڑ عمر کی عورت اور اس کا مرد ایک بہت بڑے کنول نما پتھر کے پھول کے اندر بیٹھے ہیں۔ اور اس پھول کے ساتھ سٹ کر سمندر کی سی گہرائی والا ٹھاٹھیں مارتا ہوا دریا بہہ رہا ہے۔ پانی کا بہاؤ اتنا تیز ہے کہ اس کی روانی پر نظر نہیں ٹکتی تھی۔

سپنے میں اس نے ادھیڑ عمر کے مرد اور عورت کی طرف دیکھا تو اس کی نگاہیں عورت کے چہرے پر جمی کی جمی رہ گئیں۔ اسے یہ جان کر تعجب ہوا کہ وہ عورت کوئی اور نہیں بلکہ وہ

خود ہے اس طرح اس نے کنول پھول کے اندر دریا کے اس بہاؤ سے خود کو محفوظ پایا تو پرماتما کا شکر ادا کیا۔

لیکن تبھی اس کے دیکھتے دیکھتے آن کی آن میں دریا کا پانی چڑھنا شروع ہوا اور کنول پھول کے اندر بھرنے لگا۔ دوسرے ہی لمحے وہ اور اس کا مرد اپنے بچاؤ کے لیے پانی میں ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔

''ہم ایک ساتھ جیئے ہیں تو ایک ساتھ مریں گے۔'' اس کے مرد نے کہا تھا۔

پھر عام طور پر جیسا کہ اس طرح کے سپنوں میں ہوتا ہے، وہ دریا اور پتھر کا کنول پھول کہیں غائب ہو گئے تھے، اور لیسا نے اپنے آپ کو دُنیا کے سب سے اونچے مقام پر پایا، جہاں کسی دریا کا کوئی تصور ہی نہیں کر سکتا۔ پھر ایک عمارت کے اندر اطمینان سے بیٹھے بیٹھے اس نے دیکھا کہ سامنے ڈھلان پر پانی کی پتلی سی مگر بہت تیز دھار نیچے کی طرف دوڑتی چلی آ رہی تھی۔ اس کے سامنے بڑے بڑے پتھروں کی چٹانیں یوں لڑھک رہی تھی جیسے وہ چھوٹے چھوٹے کنکر ہوں۔

''نہیں۔ ان سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔'' کسی نے اسے بتایا۔ چوٹیوں پر جب موسلا دھار بارش ہوتی ہے تو ڈھلانوں پر ایسی اٹھا پٹک معمول کی بات ہے۔''

پرماتما کا شکر ہے کہ یہ محض ایک سپنا تھا اور سپنوں کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔ لیسا سپنے کے ماحول سے باہر آ کر واپس اپنی چٹان پر بیٹھ گئی۔

چٹان کے اردگرد دُور تک پھیلے پہاڑی پھولوں کی خوشبو سے ہوا بوجھل ہو رہی تھی۔ اس نے اطمینان کی ایک لمبی سانس لی اور اس کا وجود زندگی کی خوشبو سے معطر ہو گیا۔

''گوں۔ گوں گوں۔'' شہد کی کوئی مکھی کسی پھول کے گرد منڈلاتے منڈلاتے اس کے چہرے کے چاروں طرف یوں اُڑنے لگی جیسے اس کا چہرہ بھی کوئی خوش رنگ، خوش ذائقہ پھول ہو۔ اس مکھی کو بڑی آہستگی سے اپنے چہرے سے دُور ہٹاتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔

''ہر طرف ماحول کتنا خوبصورت ہے۔

چاروں طرف پھیلی ہوئی یہ پھولوں بھری وادی
ہر طرف ہریاول سے ڈھکے پہاڑ۔
پہاڑوں پر رُکتی یہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں۔
اور آسمان سے سونا برساتی یہ نرم گرم دُھوپ۔''

یہ سب جملے وہ اونچی آواز میں اپنے آپ سے کہہ رہی تھی، اور اسے لگ رہا تھا جیسے اس کی اپنی آواز میں شہد کی سی مٹھاس بھر گئی ہو۔ اسے اپنی آواز بڑی بھلی بھلی سی لگ رہی تھی۔

تبھی اس نے پھر اپنے آپ کو پانی کے بہاؤ میں لہروں سے لڑتے ہوئے پایا۔

''نہیں۔'' وہ تو محض ایک سپنا تھا۔ اس خیال کو اس نے پھر اپنے ذہن سے جھٹک دیا، اور اُس تتلی کے پنکھوں میں بکھرے ان گنت رنگوں کی طرف دیکھنے لگی جو بڑے اطمینان سے ایک پھول پر بیٹھی اُس پھول کا حصّہ ہی بن گئی تھی۔

لیسا نے سوچا— ''میں تو قدرت کے اس حسین باغ میں ایک خوبصورت سی تتلی ہوں۔ ایک دن میں بھی اس تتلی کی طرح زندگی میں داخل ہوکر رنگ برنگے پھولوں کی خوبصورتی سے لطف اندوز ہوں گی۔ بڑا مزا آئے گا۔ تتلی بن کر کبھی اس پھول پر منڈلاؤں گی کبھی اس پھول پر جا کر بیٹھوں گی۔ زندگی میں خوشبو ہی خوشبو بکھر جائے گی۔

اور وہ تصور ہی تصور میں تتلی بنی رنگ رنگ کے پھولوں کے بیچ منڈلانے لگی۔

اس طرح پتہ نہیں کتنی دیر تک وہ اپنے تصور کی دل کش دُنیا میں کھوئی رہی۔ اس وقت اس کے چہرے سے اس کا حُسن یوں دمک رہا تھا جیسے وہیں سے سندرتا کا مانسروور پوتر جل میں نہا دھو کر دُنیا پر آشکار ہو رہا ہے۔ اس کا ماتھا ایسا چمک رہا تھا جیسے سورج کی کرنوں میں چھپے ساتوں رنگ بکھر کر ہزاروں رنگوں میں ڈھل گئے ہوں۔ اس کے چہرے پر بھکشوؤں کی سی سادگی تھی اور اس سادگی کے پیچھے سے تپسیوں کے ماتھے پر دمکنے والا نور چھلک چھلک پڑ رہا تھا۔

اپنے گلے میں ست رنگی پینگھ کی مالا پہنے وہ تصور ہی تصور میں افق پر پھیلی لالی میں

کہیں چھپی ہوئی تھی۔ تبھی اس کا دھیان بٹا— کہیں قریب سے ہی کسی کے کراہنے کی آواز آ رہی تھی۔

وہ گھبرا کر اپنی چٹان سے نیچے اتری اور گرتی پڑتی اس آواز کی طرف بھاگی۔ قریب جا کر اس نے دیکھا کہ ایک آدمی زخموں سے چُور، ایک بڑی چٹان کے پیچھے زندگی کی آخری سانسیں لیتا ہوا، نیم بے ہوشی کی حالت میں پڑا ہے اور سردی کے مارے اس کا جسم ٹھنڈا پڑتا جا رہا ہے۔

لیسا کو لگا، جیسے یہ آدمی اس کے سپنے والے طوفان کی زد میں آ گیا تھا اور اس کے بہاؤ کی تیز لہریں اسے اس چٹان کے نیچے پٹخ گئی تھیں—

''ہوں! میں بھی کیسی مورکھ ہوں۔ وہ سپنا تھا اور یہ حقیقت ہے۔'' لیکن اس وقت اسے یہ سب سوچنے کی فرصت نہیں تھی۔ وہ جلدی سے اپنی ایک بھیڑ پکڑ لائی اور اس کے دودھ کی دھاریں سیدھے اس کے منھ پر ماریں۔ پھر کچھ جھاڑیاں اکٹھا کر کے آگ جلا کر اس کے جسم کو گرمی پہنچانے کی کوشش کی۔ اس سے بات نہ بنی تو اس کے ٹھٹھرتے جسم کو اپنے جسم کے ساتھ چمٹا کر اس کی سردی کو دور کیا۔ اس دوران اس کی ہتھیلیوں کو رگڑا۔ اس کی چھاتی پر ہاتھوں سے مالش کی۔ اس طرح اس کی اکھڑی ہوئی سانسیں ذرا ٹھیک ہوئیں تو اس کے زخموں کو پانی سے دھویا، صاف کیا۔ اپنی چنری کو پھاڑ کر ان پر پٹی باندھی۔ پھر آگ پر دودھ گرم کر کے اس کے منھ میں تھوڑا تھوڑا ٹپکایا تو کافی دیر بعد اس آدمی کے جسم میں زندگی لوٹ آئی— اپنی آنکھیں کھولتے ہوئے اسے ایسا لگا کہ جیسے وہ موت کے اندھیروں سے لڑتا بھڑتا، سر ٹکراتا، آخر زندگی کی روشن وادی میں لوٹ آیا ہو۔

اسے آنکھوں کھولتے دیکھ کر لیسا کی جان میں جان آئی۔

''میں بہت بڑے طوفان کی زد میں آ گیا تھا۔'' اس آدمی نے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں کہا۔

اور لیسا کی آنکھیں کے سامنے ایک بار پھر سپنے والا پانی کا بہتا ہوا دریا اور پہاڑ کی ڈھلان سے لڑھکتی ہوئی بڑی بڑی چٹانیں آ گئیں۔

''کہیں یہ آدمی سپنے میں آیا میرا مرد تو نہیں ہے۔'' اسے یاد آیا— جب وہ بہاؤ سے نکل کر محفوظ مقام پر تھی تو اکیلی تھی۔

''میں نے تو ابھی شادی بھی نہیں کی—'' وہ شرما کر حقیقت کی دُنیا میں لوٹ آئی۔

لیکن یہ ہے تو اسی دُنیا کا مرد— اسی دُنیا کا باسی۔ کسی لیسا کا شوہر۔

تھوڑی دیر بعد وہ زخمی آدمی اپنے پاؤں پر کھڑا ہو کر چلا گیا۔

اس کے نظروں سے اوجھل ہوتے ہی لیسا بھی چٹان سے نیچے اُتری۔ اس نے اپنے سارے ریوڑ کو اکٹھا کیا۔ ایک بار پھر چاروں طرف دیکھا— کہیں بھی کوئی چٹان کنول پھول میں نہیں ڈھلی تھی۔ کہیں کوئی تیز بہاؤ والا دریا نہیں بہہ رہا تھا۔

کہیں کوئی خطرہ نہیں منڈلا رہا تھا۔

لیسا نے سورج کی طرف دیکھا۔

سورج لیسا کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

لیسا سورج کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔

چاروں دشاؤں نے لیسا کے ہونٹوں سے مسکراہٹ لے کر دھرتی پر چاروں طرف بکھیر دی۔

ایسے محفوظ اور خوش گوار ماحول میں لیسا اپنا ریوڑ لے کر گھر کی طرف لوٹ پڑی۔

○○○

رُوداد پاگل خانے کی

ایک ماہر نفسیات ڈاکٹر کچھ دنوں پہلے بریلی کے پاگل خانے میں آیا اور اُس نے رائے دی کہ تازہ ترین معلومات کے مطابق اگر پاگلوں کو وہ سب کچھ کرنے کی اجازت دے دی جائے جو وہ کرنا چاہتے ہیں تو اس سے ان کی صحت پر بہت اچھا اثر پڑتا ہے۔ انہیں اپنی مرضی کے مطابق اپنے من کی گتھیاں سلجھانے کا جو موقع ملتا ہے، اس سے خاطر خواہ نتائج نکلتے ہیں۔ ایک تجربے کے مطابق تیس سے چالیس فی صد پاگل تندرست ہو گئے اور باقی کو بھی افاقہ ہوا۔

بریلی کے پاگل خانے میں یہ نسخہ آزمایا گیا، اس کی روداد حسبِ ذیل ہے:

ان سارے پاگلوں کی کل تعداد ۹۹۶ تھی جن کو پاگل خانے کی ہی چار دیواری کے اندر کھیلوں کے لمبے چوڑے میدان میں چھوڑ دیا گیا تھا تا کہ وہ کھل کھیلیں۔

پاگل خانے کا سارا عملہ ڈاکٹر، نرسیں، سپاہی، چوکیدار، مالی، چپراسی سب کے سب اپنے اپنے دفتروں اور دوسرے ٹھکانوں پر اس طرح چھپ کر بیٹھ گئے، جہاں سے وہ پاگلوں پر پوری نظر بھی رکھ سکتے تھے لیکن پاگلوں کی نظروں سے اس طرح چھپے تھے، جیسے وہ وہاں موجود ہی نہ ہوں۔

اب پاگل خانے میں ہر طرف پاگلوں کا راج تھا۔

عملے میں سے کسی کا نہ ہونا پاگلوں کو مزید پاگل بنائے دے رہا تھا۔

ماجرا کیا ہے؟ وہ سمجھ نہیں پا رہے تھے۔

اس سے پہلے بھی سال میں دو مرتبہ پندرہ اگست اور چھبیس جنوری کو پاگلوں کو اس

میدان میں لاکر کھڑا کیا جاتا تھا۔ پھر قومی ترانہ ہوتا تھا: جن گن من ادھینا یک جے ہے..... اور پھر اس کے بعد مٹھائی بٹتی تھی۔ پانچ پانچ لڈو۔ ان لڈوؤں کو کچھ پاگل بھوکوں کی طرح کھا لیتے تھے۔ کچھ اسے قیمتی سرمایہ سمجھ کر اپنے اپنے کمروں میں لے جاتے تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو سوچتے تھے کہ کہیں ان میں زہر نہ ملا ہو۔ اس لیے یا تو وہ لڈوؤں کو اس طرح پھینک دیتے تھے کہ کوئی انہیں ایسا کرتے ہوئے دیکھ نہ پائے۔ اور کئی جو اپنے شک میں پورا ایمان رکھتے تھے وہ اپنے کمرے میں لے جا کر کیڑے مکوڑوں کو کھلا کر دیکھتے تھے کہ مٹھائی کھا کر ان پر کیا اثر ہوتا ہے۔ لیکن کیڑوں کے نہ مرنے پر بھی ان کا شک دُور نہیں ہوتا تھا، اور وہ مٹھائی نہیں کھاتے تھے۔

لیکن اس وقت ایسا کچھ نہیں ہوا۔

نہ جھنڈا لہرایا گیا، نہ گانا گایا گیا۔ نہ لڈو بٹے۔ آخر ایک پاگل جھنڈا لہرانے والے لوہے کے کھمبے پر، جو اینٹوں کے چبوترے پر گڑا ہوا تھا چڑھ گیا۔ پہلے تو اس نے بڑے محتاط ہو کر چاروں طرف سر گھمایا اور جب اسپتال کے عملے کا کوئی آدمی نظر نہ آیا تو پہلے تو اس نے مایوسی میں چاروں طرف دیکھا اور پھر اس کے چہرے پر خوشی کے ایسے آثار نمودار ہوئے جیسے کسی بھی استاد کو اسکول میں نہ پا کر دیہات کے بچوں کے ہوتے ہیں۔ اس خوشی کا اظہار اس نے ایسے کیا کہ اپنے نیفے میں اُڑسا ہوا ایک پاؤ بھر کا پتھر، جو وہ کسی انجانے دشمن کو مارنے کے لیے برسوں سے اپنے پاس رکھتا آیا تھا، اس نے اسے نیفے سے نکالا اور پھر لوہے کے کھمبے پر مار مار کر ٹن ٹن کی آواز نکالی جیسے وہ سارے پاگلوں کے لیے پوری چھٹی کا اعلان کر رہا ہو۔

پوری چھٹی کا اعلان ہوتے ہی ایک پاگل جو برسوں سے مَون دھارن کیے ہوئے تھا، اس کے گلے سے کچھ ایسی آواز پھوٹ پڑی جیسے راستہ مل جانے پر بانس کے ٹکڑے سے گزرتی ہوئی ہوا میٹھی سُریلی سی آواز میں ڈھل جائے۔

ایک گونگے کے منھ سے پہلی بار ایسی آواز نکلتے دیکھ کر دوسرا پاگل جو ہمیشہ چیختا چنگھاڑتا رہتا تھا، یہ سوچ کر مون ہو گیا کہ اگر گونگے بولنے لگیں تو زبان رکھنے والوں کو مون

دھارن کر لینا چاہیے تا کہ حساب برابر رہے اور قدرت کا نظام بگڑنے نہ پائے۔

اس کے بعد پول پر ٹنگے ہوئے پاگل نے نہیں بلکہ ایک اور پاگل جو اپنے گلے میں ہر وقت سیٹی لٹکائے رکھتا تھا وہ سیٹی بجاتے ہوئے میدان میں چاروں طرف یوں دوڑنے لگا جیسے وہ سب کھلاڑیوں کو اپنا اپنا کھیل شروع کرنے کے لیے کہہ رہا ہو۔

پھر کیا تھا۔ ہر طرف تماشہ شروع ہو گیا۔

ہنسنے والے پاگلوں نے ٹھہاکے لگانے شروع کر دیے۔ رونے والے پاگلوں نے ایسی دہاڑیں ماریں کہ ہنسنے والے پاگلوں کے بھی دل پسیج گئے اور ہنستے ہنستے ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی برسات ہونے لگی۔ چند پاگل ایسے تھے جو صرف کسی کونے میں ہی اُٹھتے بیٹھتے تھے۔ اب اس میدان میں جب ان کو کوئی کونہ نہ ملا تو ان کے دماغ اور خراب ہو گئے۔ وہ پریشانی کے عالم میں گھبرائے ہوئے کبھی اِدھر جاتے اور کبھی اُدھر دوڑتے، لیکن وہاں کوئی کونہ ہو تو انہیں سکون نصیب ہو۔ ایسے میں ایک پاگل کو ایک پیڑ کی دو اُبھری ہوئی جڑیں تنے کے بیچ میں ایک کونہ سا بناتی ہوئی لگیں۔ اس نے اسی کو غنیمت جانا اور وہاں جا کر بیٹھ گیا۔ ایک کو بیٹھا دیکھ کر دوسرے پاگلوں نے سوچا کہ یہاں یقیناً کوئی کونہ ہوگا جو گرو بیٹھ گیا ہے، اس لیے وہ بھی سکڑ کر اس کے پاس بیٹھ گئے۔ وہ دل میں بڑے خوش تھے کہ آخر انہیں بیٹھنے کے لیے مناسب جگہ مل گئی۔ پھر بھی ان کو تعجب ہو رہا تھا کہ یہ کون سا کونہ ہے جس کے چاروں طرف لوگ گھوم رہے ہیں۔

ایک نے اُٹھ کر دیکھنا چاہا تو دوسرے نے پکڑ کر بٹھا لیا۔

''یار یہ ہے کونہ ہی۔ ہمارے گرد گھومنے والے لوگ پاگل ہیں جو یہ سمجھ نہیں پا رہے ہیں کہ یہ کونہ نہیں ہے۔''

جہاں یہ لوگ ایک کونے میں دبک کر بیٹھے تھے وہاں ان کے پاس ہی اس پیڑ کے نیچے ایک پاگل ہوا میں ہوائی کتاب کے ورق پلٹتا ہوا اپنے مطالعے میں اس طرح محو ہو گیا جیسے دُنیا جہان سے اس نے رشتہ توڑ لیا ہو۔ ہوا میں لکھی تحریر سے اس کے ذہن پر جو اثرات مرتب ہو رہے تھے وہ جب اس کے چہرے پر جھلکتے تو دیکھنے والے کو پتہ چل جاتا کہ وہ

زندگی کے کس قسم کے تجربات سے دوچار ہو رہا ہے۔ لیکن اس کا ایک مسئلہ حل نہیں ہو رہا تھا ــــ چلتی ہوئی ہوا اس کی ہوائی کتاب کے پنّوں کو الٹ پلٹ دیتی تھی۔ اس سے اس کی پڑھائی میں خلل پڑ رہا تھا۔

ایک جگہ اور تماشہ ہو رہا تھا۔ ایک پاگل اپنے دونوں ہاتھ زمین پر ٹکائے گائے بنا کھڑا تھا۔ دوسرا پاگل اس کی پچھلی ٹانگوں کے نیچے بیٹھا گائے کا دُودھ دوھ رہا تھا۔ کچھ پاگل ان کے اردگرد گھیرا ڈالے کھڑے تماشہ دیکھ رہے تھے۔ گائے بنا پاگل تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ٹانگ مار کر اس کی دُودھ سے بھری بالٹی گرا دیتا تھا۔ دودھ دوہنے والا پاگل پریشان ہو جاتا تھا۔ وہ کبھی گائے کی ٹانگوں کو رسّی سے باندھتا، کبھی پاس کھڑے پاگل سے کہتا کہ وہ منھ کی طرف سے گائے کو قابو میں رکھے۔ ہزار کوشش کے باوجود اس کی بالٹی خالی کی خالی رہ جاتی تھی۔ وہ بڑی حسرت بھری نظروں سے اردگرد کھڑے پاگلوں کی طرف دیکھتا تھا اور کبھی اپنی خالی بالٹی کی طرف۔ یہ حسرت اردگرد کھڑے پاگلوں کے چہروں پر بھی مایوسی بن کر بکھر رہی تھی۔ وہ سوچ رہے تھے کہ اگر یہ بالٹی بھر جائے تو شاید انہیں بھی دودھ چکھنے کو ملے لیکن ہائے ری حسرت.....

اس طرح گائے بنا پاگل اور اُس کا دُودھ دوھ رہا پاگل، اور یہ تماشہ دیکھنے والے پاگل ــــ سب کے سب بے حد بیزار نظر آ رہے تھے۔

چار پاگل جو قومی ترانہ گانے کے لیے پول کے نیچے کھڑے تھے، وہ گم سم سے بار بار اُدھر دیکھ رہے تھے جدھر سے پاگل خانے کے ڈاکٹر لوگ آتے تھے۔ ان کا انتظار ختم نہیں ہو پا رہا تھا۔ قومی ترانے کے بول ان کے سینے سے پھوٹتے، ان کے ہونٹوں پر آتے تھے۔ انہیں اپنے ہونٹوں کو بند رکھ کر قومی ترانے کے الفاظ کو منھ کے اندر ہی روکنے اور واپس اپنے سینے کے اندر بھیجنے میں بڑی دقّت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ پانی کے بہاؤ اور دل کی آواز کو روکنا بڑا مشکل کام ہوتا ہے۔ گھڑے کا سارا پانی بہہ جانے پر ایک بار انھیں کتنی دیر پانی پینے کو نہیں ملا تھا۔ اگر وقت سے پہلے ہی قومی ترانے کے بول منھ سے نکل گئے تو وقت آنے پر وہ کیا کریں گے۔

اس مشکل کا حل انھوں نے اس طرح ڈھونڈا

رہنے دیجئے۔ انھوں نے ایک دوسرے کو ایسی ایسی گندی گالیاں دینی شروع کر دیں کہ انھیں تحریر میں نہیں لایا جا سکتا۔

اس قسم کی حرکتیں تو صرف شریف قسم کے یا یوں کہہ لیجئے کہ نیم پاگل قسم کے پاگلوں کی تھیں۔ لیکن پاگلوں کی اتنی بڑی تعداد میں کچھ ایسے پاگل بھی تھے جو پاگل خانے میں بے حد خطرناک سمجھے جاتے تھے، انھیں جب زنجیروں کے بندھنوں سے آزاد کر دیا گیا تو اوّل تو انھیں یقین ہی نہ ہوا۔ ایسے کئی پاگل تو اب بھی میدان میں اپنی جگہ سے ہل نہیں رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ اب بھی بندھے ہوئے ہیں۔

ایسے ایک پاگل نے دوسرے پاگل سے کہا: ''اُٹھو۔''

وہ نہیں اُٹھا۔ اسے اپنی مجبوری کا پورا احساس تھا۔

''ارے میں کہتا ہوں اُٹھو۔''

وہ پھر بھی نہیں اُٹھا۔

پہلے پاگل کو غصہ آ گیا۔ اس کی یہ مجال کہ میرے کہنے پر بھی اُٹھ نہیں رہا۔ اُس نے اس کی پیٹھ پر اتنے زور کی لات ماری کہ درد اس کی ہڈی تک پہنچ گیا۔

مار کھانے والے پاگل کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ وہ منھ سے جھاگ پھینکتا ہوا بولا: ''اگر میرے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے نہ ہوتے تو اَب تک تمہاری ہڈی پسلی ایک کر دی ہوتی۔''

پھر وہ درد بھری آواز میں چلّانے لگا: ارے کوئی میرے ہاتھ پاؤں کھول دو۔ کوئی میرے پاؤں کی بیڑیاں کھول دے تو میں اس کی وہ ٹانگ توڑ کر رکھ دوں جو اس نے مجھے ماری تھی۔'' یہ کہتے ہوئے وہ جوش سے بھرا ہوا اُٹھا اور اس پیڑ کو ایک جھٹکے سے زمین سے اُکھاڑ پھینکا، جس کی جڑوں کو کونہ سمجھ کر پاگل بیٹھے ہوئے تھے۔

پیڑ کو جڑ سے اُکھاڑ کر وہ پاگل پھر وہیں جم کر بیٹھ گیا اور چلّانے لگا: ''ارے کوئی میرے ہاتھ پاؤں کی بیڑیاں کھول دو۔ میں اُس پاگل کی ٹانگ توڑنا چاہتا ہوں جس نے

میری پیٹھ پر لات ماری ہے۔''

یہ سُن کر اردگرد کے پاگل اس کے پاگل پن پر ہنسے نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پاگلوں میں اس اصول پر عام طور پر عمل کیا جاتا ہے کہ کوئی پاگل دوسرے پاگل کے پاگل پن کا مذاق نہیں اُڑائے گا۔

اس کے برعکس سب کے سب بڑی سنجیدگی سے سوچنے لگے کہ اس مجبور انسان کی کس طرح مدد کی جائے کہ اسے پورا انصاف مل سکے۔

ابھی وہ اس مسئلے کا کوئی حل ڈھونڈھ نہیں پائے تھے کہ ایک دوسرا معاملہ کھڑا ہو گیا۔

ہوا یہ کہ وہ پاگل جو خاموش کھڑا ہوا میں ہی پنّے پلٹتا ہوا اپنی ہوائی کتاب پڑھ رہا تھا، اسے لگا جیسے کہانی کا تسلسل ٹوٹ رہا ہے اس نے اپنے پنّے اُلٹ پلٹ کر دیکھے۔ اُسے لگا جیسے اس کی ایک دو پنّے غائب ہیں۔ اس نے نظر دوڑا کر دیکھا۔ ہوا دو سُوکھے پتّوں کو اُڑائے جا رہی تھی۔ اپنی کتاب کے پنّوں کو پکڑنے کے لیے بھاگا تو وہ بے خیالی میں ایک خطرناک قسم کے پاگل سے ٹکرا گیا۔

''اچھا! تو تو مجھ سے ٹکر لے رہا ہے؟ تیری یہ مجال!''

اور خطرناک پاگل نے اس پڑھا کو پاگل کو گلے سے پکڑا اور زمین پر اس طرح پٹک دیا جیسے کوئی دیوہیکل قسم کا پہلوان مریل سے آدمی کو اکھاڑے میں پٹک کر کہتا ہے۔ ''ابے ہمّت ہے تو اُٹھ!''

''ارے مارا۔ مارا؟'' سیٹی والا پاگل سیٹی بجاتا ہوا سپاہی بن کر موقعہ واردات پر آ گیا اور خطرناک قسم کے پاگل کو کلائی سے پکڑ کر بولا۔ اب ہلنا نہیں۔''

''سب غلط۔'' ایک دوسرا پاگل خطرناک قسم کے پاگل کی کلائی کو چھڑاتے ہوئے بولا:

''سب غلط ہے۔ پولیس موقعۂ واردات پر فوری طور پر کبھی نہیں آتی۔ اور اس وقت تو قطعی نہیں آتی جب مجرم موقعۂ واردات پر موجود ہو۔'' یہ کہہ کر اس نے تائید کے لیے چاروں طرف دیکھا۔

سب نے ہامی بھری۔

اب خطرناک پاگل کو کھلی چھوٹ تھی۔ وہ گھونسوں اور لاتوں سے زمین پر پڑے ہوئے پاگل کی مرمّت کرنے لگا۔ ساتھ ہی اس نے اس پاگل کو بھی پکڑ لیا جو سپاہی بن کر آیا تھا۔ وہ دونوں کو دونوں ہاتھوں میں پکڑے ان کے سر آپس میں ٹکرانے جا رہا تھا کہ دو اور خطرناک قسم کے پاگلوں نے سوچا کہ یہ پاگل جو مار کھا رہے ہیں یہ تو ہماری بیرک کے ہیں اور یہ جو مارنے والا ہے یہ دوسری بیرک کا ہے۔ ہمیں اپنی بیرک والے پاگلوں کی مدد کرنی چاہیے۔

وہ بھاگ کر موقعۂ واردات پر پہنچے اور مار کھانے والوں سے بولے "ارے تم مرجانے کا بہانہ کرو۔ ورنہ یہ تمہیں جان سے مار ڈالے گا۔"

مار کھانے والے لاشیں بنے زمین پر پھیل گئے۔

پاگلوں کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ وہ زندہ لوگوں کو مارتے ہیں، لاشوں کو نہیں۔ اس لیے اس نے مرے ہوؤں کو مارنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

مارنے کا ارادہ تو ترک کر دیا، لیکن اس کا غصّہ ابھی ٹھنڈا نہیں ہوا تھا اور جب غصّہ ٹھنڈا نہ ہو تو اچھا بھلا آدمی پاگل ہو جاتا ہے، اور وہ تو تھا ہی پاگل! اس لیے وہ ان دونوں پاگلوں کو ڈھونڈھنے لگا جو اس کے شکار کو بچا کر خود موقعہ واردات سے کھسک لیے تھے۔

وہ موقعۂ واردات سے کھسک تو لیے تھے لیکن وہ بدمعاشوں کی نفسیات سے پوری طرف واقف تھے۔ انہیں پہلے سے معلوم تھا کہ وہ بدمعاش ان کا پیچھا ضرور کرے گا۔ اور اگر پیچھا کیا تو پھر اس سے دو دو ہاتھ کی نوبت بھی آسکتی ہے۔

اس تصادم سے بچنے کے لیے انہوں نے اپنی طاقت بڑھانا ضروری سمجھا۔ وہ آن کی آن میں دائیں طرف گئے اور دائیں طرف کھڑے پاگلوں کو بائیں طرف کے پاگلوں سے الگ کرنا شروع کر دیا۔

دائیں طرف کے پاگل الگ۔

بائیں طرف کے پاگل الگ۔

دونوں جلدی جلدی دونوں دھڑوں کو الگ کر رہے تھے۔

"تم نے دیکھا نہیں۔ دائیں طرف والا پاگل بدمعاش ہمارے بائیں طرف والے

دو بھائیوں کو مار رہا تھا۔ آج انہیں مارا، کل کسی اور کو ماریں گے اس لیے اپنا دھڑا الگ کر کے اپنی طاقت بڑھالو۔

کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ دائیں بائیں کا شور سُن کر ہر طرف افراتفری مچی تھی، کوئی ادھر بھاگ رہا تھا کوئی اُدھر۔ کچھ بائیں طرف کھڑے پاگلوں کی بیرکیں دائیں طرف تھیں۔ کچھ دائیں طرف والوں کی بیرکیں بائیں طرف تھیں۔ زیادہ تر پاگلوں کو تو دائیں بائیں کا فرق ہی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ پھر بھی بلا سمجھے ہی کسی نے اُدھر جانے کی کوشش کی جدھر اس کی بیرک والے لوگ زیادہ تھے۔

ایک پاگل کو دوسری طرف بھاگتے دیکھ کر ایک بدمعاش پاگل نے روکتے ہوئے کہا:

''اُدھر کہاں بھاگے جا رہے ہو؟''

''میری بیرک اُس طرف ہے۔''

''ارے پاگل! پاگلوں میں اوّل تو تقسیم نہیں ہوتی۔ اور اگر ہو بھی تو صرف حدوں کی تقسیم ہوتی ہے، آبادی کا تبادلہ نہیں ہوتا۔ اور پھر یہ جو ہو رہا ہے محض وقتی ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں دونوں ایک ہو جائیں گے۔''

پاگل اُدھر لوٹ گیا جدھر سے آیا تھا۔

لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ جہاں وہ کھڑا ہے، وہاں وہ کیوں کھڑا ہے اسے کہاں کھڑا ہونا چاہئے — دائیں یا بائیں۔ جب وہ کچھ نہ سوچ پایا تو اس کا دماغ اور چکرا گیا — ''دائیں بائیں — دائیں بائیں'' وہ گردان کرنے لگا اور ساتھ ہی پیروں کے ساتھ قواعد بھی۔

ایسے میں وہ دو پاگل جو مرجانے کا بہانہ کر کے مار کھانے سے بچ گئے تھے، اپنی سانسیں روکے اب بھی کوئی حرکت کیے بغیر زمین پر لیٹے تھے۔ ان کے کانوں میں جب قواعد کرنے والے پاگل کی دائیں بائیں کی گردان کی آواز پڑی تو ان میں سے ایک نے دوسرے سے دھیرے سے کہا:

''سارے پاگل دائیں اور بائیں گروہوں میں بٹ گئے ہیں۔ ہم کدھر جائیں۔؟''

''ہم تو لاشیں ہیں۔ لاشوں کا کوئی دھڑا نہیں ہوتا۔ اور پھر لاشیں کہیں جا بھی کیسے سکتی ہیں۔''

''یہ بات میری سمجھ میں کیوں نہیں آئی۔؟''

''اس لیے کہ تم مجھ سے زیادہ پاگل ہو۔''

''پاگل پن میں ہی سہی! کسی طرح، میں کسی سے بڑا تو ہوں — اگر میرا بھائی یہ مان لیتا کہ میں اس کا بڑا بھائی ہوں تو شاید میں پاگل ہی نہ ہوتا۔'' ایسا کہتے ہوئے اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔

''کیا غضب ڈھا رہے ہو۔ لاشیں رویا نہیں کرتیں۔ مرنے والے زندگی کے دُکھ سُکھ سے نجات پا جاتے ہیں۔ مرنے کا یہی تو سُکھ ہے۔''

اتنے میں جس بیرک کے دو پاگل میدان کے بیچ لاشیں بنے پڑے تھے، اس بیرک کے پاگلوں نے مل کر اپنے مرنے والے ساتھیوں کے سوگ میں رونا شروع کر دیا.....

بدمعاش پاگل تو ایک نیا دنگل شروع کر کے اپنی برتری سب پر قائم کرنا چاہتے تھے۔ اسی مقصد کے لیے انہوں نے پاگل خانے کے سارے پاگلوں کو دو دھڑوں میں بانٹ دیا تھا۔ ان پاگلوں کو یوں روتے دیکھ کر انہوں نے سوچا، یار یہ تو پالا مارے لے رہے ہیں۔ اب کیا کیا جائے؟

''ٹھہرو۔ میرے پاس اس کا علاج ہے'' — ان میں سے ایک بولا — ''آؤ میرے ساتھ۔''

پھر وہ رونے والے پاگلوں کے پاس گئے اور ان میں سے ایک پاگل سے، جو بہت دہاڑیں مار مار کر رو رہا تھا، کسی نے چپکے سے اس کے کان میں کہا —

''ارے مرنے والے تو دوسرے دھرم کے تھے۔ تم کیوں رو رو کر ہلکان ہو رہے ہو؟''

''لیکن وہ تھے تو ہماری ہی بیرک کے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے اتنے زور کی دہاڑ ماری کہ مرے ہوئے دونوں پاگلوں کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔

بدمعاش پاگلوں کا وار خالی گیا اور وہ غصّے میں بھرے ہوئے ادھر اُدھر دوڑتے ہوئے

اپنے ہاتھ لاٹھی چلانے کے انداز میں یوں گھمانے لگے جیسے جو بھی سامنے آیا، وہ اسے نیست ونابود کردیں گے۔ پھر انہوں نے مخالف سمت جا کر دو چار لوگوں کے ہاتھ جڑ بھی دیے، دو چار کو اٹھا کر زمین پر پٹکا اور پھر دوڑتے ہوئے میدان کے بیچ یوں آ کر کھڑے ہو گئے جیسے مخالفوں کو اُکسانے کی کوشش کر رہے ہوں کہ کسی مائی کے لال میں دم ہو تو سامنے آئے۔

اب جب دونوں دائیں اور بائیں دھڑوں کو ایک دوسرے کے سامنے صف آرا دیکھا تو بشن سنگھ آف ٹوبہ ٹیک سنگھ، جس کو لاہور کے پاگل خانے سے بریلی کے پاگل خانے میں بسایا گیا تھا، اور جو اَب بوڑھا ہونے کے بعد بھی "گڑ گڑ" کی گردان کرتا رہتا تھا، یکلخت ہوش کھو بیٹھا یا پاگلوں کی بھاشا میں اسے ہوش آ گیا۔ اس نے دیکھا کہ دونوں دھڑوں کے پاگل ہوا میں مُکے لہرا رہے ہیں، تلواریں چلا رہے ہیں آگ لگانے کی سی حرکتیں کر رہے ہیں، لوگوں کو آگ میں پھینکنے کے اشارے کر رہے ہیں..... دونوں دھڑوں کے لوگ ایک دوسرے کی طرف اشارے کر رہے تھے کہ ہم آ رہے ہیں۔ سب کچھ ملیا میٹ کر دیں گے۔ وہ اُچھل رہے تھے، دھمکیاں دے رہے تھے۔

بشن سنگھ کے ذہن میں آندھیاں چلنے لگیں۔ اُسے لگا جیسے اس جھکڑ میں آسمان کی چھت کا کوئی ٹکڑا چھپر کی طرح اُڑ کر زندگی کے آنگن میں گرے گا اور سب کچھ نیست ونابود ہو جائے گا۔ جیسے زمین کا کوئی ٹکڑا اس جھکڑ میں اُڑتا ہوا آ - ن سے جا ٹکرائے گا اور سورج اور چاند اور ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر جائیں گے۔

چار سو اندھیرا پھیل جائے گا۔

کچھ سجھائی نہ دے گا۔

اس اندھیرے میں اس نے دیکھا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کی آپس میں گلے ملتی ہوئی گلیوں کے ہاتھ نکل آئے ہیں اور انہوں نے ایک دوسری کا گلا گھونٹنا شروع کر دیا ہے۔

ٹوبہ ٹیک سنگھ کی طرف دھیان جاتے ہی دُھندلی دُھندلی یادیں کہیں دُور، بہت دُور جھلمل کرتے دیپوں کی طرح روشن ہو کر ٹمٹمانے لگیں اس کے سامنے ٹوبہ ٹیک سنگھ کا گاؤں، اس کی گلیاں، باغ اور کھیت آئے پھر برگد کا پیڑ اور پیپل کے پتے اس کی نظروں کے

سامنے پھیل گئے۔

تالیاں بجاتے بجاتے پتہ نہیں کیا ہوا کہ وہ یوں ٹکرانے لگے جیسے لڑ رہے ہوں، پھر بشن سنگھ کے دیکھتے ہی دیکھتے دونوں پیڑوں کو آگ لگ گئی اور وہ کاغذ کے بنے محل کی طرح آناً فاناً راکھ ہو گئے۔ یہ راکھ اُڑتی ہوئی تالاب کی طرف گئی تو اس نے دیکھا کہ کسی نے تلوار چلائی اور پانی دو پھاڑ ہو گیا۔ اس نے دوسرا وار کیا تو ہوا کے دو ٹکڑے ہو گئے۔

یہ دیکھ کر بشن سنگھ کا دماغ پھر خراب ہو گیا اور وہ اپنی گردان کرنے لگا۔ ''گڑ گڑ آف دی...'' ابھی وہ یہیں تک پہنچی تھی کہ اس کے پاؤں کے نیچے سے زمین کھسک گئی اور اسے لگا کہ وہ لڑکھڑاتا ہوا نیچے ہی نیچے گرتا جا رہا ہو۔

اپنے آپ کو گرنے سے بچانے کے لیے بشن سنگھ نے گڑ گڑ کیا۔ پھر جست لگائی اور پاس والے پیڑ کی متوازی ٹہنی پر جا کر بیٹھ گیا۔ وہ گردان کرنے لگا۔ گڑ گڑ دی آف دِی... لیکن اس کا دماغ اتنا چکرا گیا تھا کہ وہ اپنی گردان بھول گیا اور اس نے بڑے بڑے پھکڑ تولنے شروع کر دیے۔

تبھی ایک دوسرا پاگل چلّا اُٹھا۔

''سُنو سُنو! عاقلوں کے عاقل، پاگلوں کے پاگل، شاہوں کے شہنشاہ گڑ گڑ دی بشن سنگھ آف ٹوبہ ٹیک سنگھ تخت پر براج چکے ہیں باادب، باملاحظہ، ہوشیار۔ انصاف کے لیے ملزم حاضر ہو۔ جھوٹوں کا منھ کالا، جھوٹی زبان پر تالا۔ دربار ٹوبہ ٹیک سنگھ کا۔ بول سانچے دربار کی جے۔ گڑ گڑ دی بشن سنگھ آف ٹوبہ ٹیک سنگھ....'' اس طرح نعرے لگاتا ہوا سنتری بنا پاگل بائیں دھڑے میں اور دائیں دھڑے میں دونوں طرف گھوم گیا۔

دونوں دھڑوں میں سناٹا چھا گیا۔

دونوں طرف کے بدمعاش منھ لٹکا کر کھڑے کھڑے ہاتھ ملنے لگے جیسے ان کے ہاتھ آیا اچھا موقع نکل گیا ہو۔

تبھی پولیس والا اس بدمعاش کو پکڑ کر لے آیا جس سے مار کھا کر دو پاگل لاشوں کی طرح بچھ گئے تھے۔

پاگلوں کی جان لینے والے پاگل کو دیکھ کر بشن سنگھ پر پاگل پن کا بھرپور دورہ پڑ گیا۔ وہ بڑے جوش میں اُٹھا اور ہاتھ میں پکڑی ہوئی ٹہنی کے کتنے ہی پتے ایک ساتھ مٹھی میں بھر کر قیدی کی طرف یوں پھینکے جیسے وہ اس پر ریوالور سے گولیاں چلا رہا ہو۔

''گڑ گڑ دی ٹوبہ ٹیک سنگھ، گڑ گڑ دی امرتسر، گڑ گڑ دی لاہور، گڑ گڑ دی لدھیانہ، گڑ گڑ دی مراد آباد، گڑ گڑ دی ۴۸، گڑ گڑ دی گودرہ— گڑ گڑ دی احمد آباد، گڑ گڑ دی گجرات''— وہ یہ کہتا جاتا تھا اور جیسے جیسے اس کا پاگل پن بڑھتا جاتا تھا، وہ اوپر ہی اوپر چڑھتا ہوا بڑی بڑی شاخیں توڑ کر ملزم پر پھینک رہا تھا۔

آخر جب وہ تھک کر چُور ہو گیا تھا تو ایک پل کے لیے رُکا اور پھر اُسی پہلی والی شاخ پر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا اور بولا: ''گڑ گڑ دی سب پاگلوں کی۔ گڑ گڑ دی مجرم کو پھانسی، آف دی۔ آف دی...''

اس بیچ چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ صرف بشن سنگھ کی گڑ گڑ کی گردان انصاف کی آواز بن کر چاروں طرف پھیل رہی تھی— ''ملزم کو پھانسی۔ ملزم کو پھانسی۔''

اس گردان کی آوازیں سپاہی بنے پاگل کے کانوں سے ٹکرائیں تو اسے اپنا فرض یاد آ گیا، اور وہ ملزم کو لے کر دونوں دھڑوں کے بیچ سے گزرتے ہوئے جھنڈا لہرانے والے پول کی طرف چل دیا تا کہ ملزم کو پھانسی پر لٹکایا جا سکے۔

ملزم کو پھانسی کے پھندے کی طرف لے جاتے دیکھ کر لاشیں بنے دونوں پاگل اُٹھ کر سپاہی اور ملزم کا راستہ روک کر یوں کھڑے ہو گئے جیسے کہہ رہے ہوں— ''ہم تو زندہ ہیں۔ ملزم کو پھانسی کیسے ہو سکتی ہے۔''

سپاہی رُک گیا۔

لیکن ملزم سپاہی کو گھسیٹتا ہوا پھانسی کے پھندے کی طرف لے جانے کی کوشش کرنے لگا۔

دونوں دھڑوں کے پاگل مرنے والوں کو زندہ دیکھ کر ہی حیران ہو رہے تھے۔ اب سپاہی اور ملزم کی آپس کی کشمکش کو دیکھ کر ان کے دماغ اور زیادہ گڑبڑا رہے تھے۔

دونوں دھڑوں کے پاگل خاموشی سے کھڑے یہ تماشہ دیکھ رہے تھے۔

ملزم سپاہی کو پھانسی کے تختے کی طرف کھینچ رہا تھا۔

سپاہی اسے باز رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

لاشیں بنے پاگل، جو ابھی ابھی زندہ ہوئے تھے، ان میں سے ایک اپنے زندہ ہونے کی خوشی میں ہنس رہا تھا۔ لیکن اس پاگل خانے کی اذیتیں سہتے سہتے دوسرے پاگل کے اندر اس ماحول میں زندہ رہنے کی خواہش غالباً مر چکی تھی؛ اس لیے وہ مرے رہنے کا موقع ہاتھ سے چھوٹ جانے کی وجہ سے اپنی قسمت پر رو رہا تھا۔

دونوں دھڑے کے لوگ حیران و پریشان سے کھڑے تھے۔

اتنے میں ان کے کانوں میں بشن سنگھ کی چیخ سی سُنائی دی اور ان سب پاگلوں نے دیکھا کہ گڑگڑ دی آف دی آگ۔ آگ کا نعرہ بلند کرتے بشن سنگھ نے پیڑ کی شاخ سے چھلانگ لگائی اور بازو لہراتا ہوا اُس طرف لپکا جہاں کچھ پاگلوں نے مل کر سوکھے پتّوں کو اکٹھا کر کے آگ لگا دی تھی۔ آگ کے شعلے اونچے اُٹھتے ہوئے بجلی کے تاروں کے نزدیک پہنچ رہے تھے۔

آگ کو دیکھتے ہی سارے پاگل جو دو دھڑوں میں بٹے ہوئے تھے وہ آپس میں یوں ملے جیسے پانی پانی سے ملتا ہے اور ہوا ہوا سے۔ اور پھر انہوں نے پانی کے بغیر ہی ساری آگ کو پاؤں تلے روند کر مسل ڈالا۔

آگ بجھ گئی تو انہوں نے آگ لگانے والے پاگلوں کو دھر دبوچا اور انہیں اس پاگل پن کی حرکت کے لیے پاگل خانے میں بھرتی کرنے کے لیے چل دیے۔

اُس روز اسپتال والوں نے بیرکوں میں پاگلوں کی گنتی کی تو وہ پورے ۹۹۶ تھے۔ اور پھر جس طرح ان سب نے مل کر آگ سے ہونے والے ایک بڑے حادثے کو بچایا تھا، اس سے وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ ان کا تجربہ کامیاب رہا ہے۔

○○○

بندھن

''پتھر یگ کے اِنسان نے اپنے من کو اچھی لگنے والی عورت کے حُسن کو جیسے، کسی گپھا کی چٹان پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچ کر نقش کر دیا ہو۔''

اپنی جھونپڑی کے دروازے پر کھڑی وہ 'مچھیرن' دور سے پہلی نظر دیکھنے پر ایسی ہی لگی تھی۔ لیکن جب میں اور میری بیوی اُس کے قریب پہنچے تو ایسا لگا جیسے وہ، مدھیہ کال کی اجنتا یا ایلورا کی کوئی 'مورتی یا تصویر ہو اور اب ہاڈ مانس کی عورت بن کر مچھیرن کے روپ میں ہمارے سامنے کھڑی تھی۔

اور جب وہ ہمیں دیکھ کر مسکرائی تو ایسا لگا جیسے مونالیسا کی مسکراہٹ اس کی مسکراہٹ کے سامنے پھیکی پڑ رہی ہو۔

وہ واقعی بہت خوبصورت تھی۔ رنگ تو کالا تھا۔ سیاہ کالا۔ لیکن اس کے جسم کا ہر انگ، نین نقش ایسے تھے جیسے قدرت نے اُسے پیدا کرنے کے بعد سوچا ہو کہ دُنیا میں انسان کو اِسی شکل وصورت کے ساتھ پیدا کرنا چاہیے۔ مچھیرن کا ہر انگ، اتنا مکمل، اتنا جاذب نظر تھا کہ دیکھتے دیکھتے آنکھیں تھک جائیں لیکن دل نہ بھرے۔

اُس مچھیرن اور اُس کی جھونپڑی کی پُشت میں نیچے نیلا ساگر اور اُوپر گہرے گھنگھور بادلوں سے ڈھکا ہوا آسمان، جیسے اُس کی سندرتا کو اپنے اندر بسا کر دھرتی کے آخری چھور تک اور آسمان کی آخری بلندی تک پھیلا رہا تھا۔ اس لیے اُس مچھیرن کی وجہ سے ساری دُنیا خوبصورت ہو گئی تھی۔ ساری کائنات دلکش بن گئی تھی۔

اُس مچھیرن کی خوبصورتی کو دِل ہی دِل میں بسائے ہم میاں بیوی اُس کی موسل نما

جھونپڑی کے اندر آ گئے تو ہم دونوں اچنبھے میں آ گئے۔ ہمیں لگا کہ سورگ اِس سے زیادہ خوبصورت نہیں ہوسکتا، پِلے پتے 'چولھے سے سلیقہ دمکتا ہوا، پاس ہی رکھے چم چم کرتے برتنوں سے مُچھیرن کا قرینہ چمکتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ جھونپڑی کے اندر آدھے حصّے میں اُس نے چھت ڈال کر پرچھتی بنائی ہوئی تھی، جس کے اوپر رکھا سامان یوں لگتا تھا جیسے کسی فنکار نے اپنے شاہکاروں کو سجا رکھا ہو۔

غرضیکہ جھونپڑی کی ہر چیز سے اُس عورت کا سگھڑپن، اُس کی سیانپ چھلک چھلک پڑ رہی تھی۔ میں اور میری بیوی دونوں دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہے تھے اور آنکھوں ہی آنکھوں میں جھونپڑی میں بکھرے حُسن کا اعتراف کر رہے تھے۔

یہی وجہ تھی کہ جھونپڑی کے اندر کی چیزوں سے چھلکتی خوبصورتی کے بعد جب میری نظر دوبارہ اُس مُچھیرن کے چہرے پر جا کر ٹکی تو میں نے اُس کے بارے میں بہت کچھ سوچ ڈالا اور جاگتے میں کتنے ہی سپنے بن ڈالے۔

میں نے سوچا۔ پرانے زمانے میں ٹرائے کی جنگ اِسی مُچھیرن کے لیے ہوئی ہوگی۔ تب اس کا نام ہیلن رہا ہوگا۔ یا یہ کہ شاید یہی مُچھیرن کلوپترا بن کر جب مرد پر حکومت کرتی تھی تو بڑے بڑے یودھاؤں کی نظریں اِس کے حضور سجدہ کرنے کے لیے جھکی رہتی تھیں۔ یا پھر یہ کہ اِس عورت کے لیے کورو کشیتر کے سے رن پڑ سکتے ہیں۔

اور پھر اُس مُچھیرن کی خوبصورتی نے مجھ پر ایسا جادو جگایا کہ اُس کی جھونپڑی میں بیٹھا بیٹھا نہ جانے کیسے میں پرانے وقتوں کے اُس جنگل میں پہنچ گیا جہاں میں تب ایک گپھا میں رہا کرتا تھا۔ وہاں پہنچتے ہی وہ جگہ بڑی جانی پہچانی لگی۔ اپنی اپنی سی۔ اور مجھے بہت سی پرانی باتیں یاد آنے لگیں۔ تب اس گپھا کے باہر ہر طرف اوبڑ کھابڑ سی جگہ تھی، جس میں ہر طرف کانٹے دار جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ اُن کانٹے دار جھاڑیوں کے بیچ سے گزرتے ہوئے میرے جسم میں جا بجا کانٹے چبھتے رہتے تھے۔ اِس چبھن کی وجہ سے میرے جسم میں کہیں نہ کہیں درد ہوتا ہی رہتا تھا۔ تبھی ایک شام گپھا کے اندر بیٹھے بیٹھے میں نے محسوس کیا، جیسے جھاڑیوں کے پیچھے سے سورج طلوع ہو رہا ہو۔ شام کو تو سورج میری گپھا کے پیچھے کی طرف

ہوتا ہے یہ نیا سورج کہاں سے نکل آیا۔ میں حیران سا ہو کر دیکھنے کے لیے اُٹھا تو سامنے اسی مچھیرن کی شکل وصورت کی عورت جگمگا رہی تھی۔ اس نے پھولوں کے زیور پہن رکھے تھے۔

''میں راستہ بھول گئی ہوں۔'' اس نے گپھا کے اندر آتے ہوئے کہا تھا۔

اور اگلی صبح میں نے دیکھا کہ میری گپھا کے باہر کافی دور تک کانٹے دار جھاڑیاں غائب تھیں۔

'' لگتا ہے راستہ بھول کر تم صحیح جگہ پر آ گئی ہو۔'' میں نے گپھا کے آنگن کو صاف ہوا دیکھ کر کہا تھا۔

''ہاں''۔ میں صحیح مقام پر پہنچ گئی ہوں۔'' اس نے میری ایڑی سے ایک بڑے سے کانٹے کو نکالتے ہوئے کہا۔ میری ایڑی سے کانٹا نکلتے ہی اُس کے چہرے پر سُکھ کا احساس چھلک اُٹھا تھا۔

مجھے درد سے نجات ملی۔ راحت کی سانس لے کر گپھا کے باہر دیکھا تو ایسے لگا جیسے میرے قریب سے کہیں پھولوں کی سی مہک آ رہی ہو۔

یہ اُس عورت کے جسم کی خوشبو تھی۔

'' پرانی یادوں سے نکل کر میری دُنیا میں آ جاؤ۔'' مچھیرن نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھ کر کہا۔

میں تصور کی دُنیا سے نکل کر مچھیرن کی جھونپڑی میں پہنچ گیا۔ اور یہ محسوس کیا کہ میرے پاس بیٹھی مچھیرین کے جسم کی خوشبو، ہو بہو، گپھا والی عورت کے جسم جیسی تھی۔

میں دِل ہی دل میں حیران ہو رہا تھا۔

'' آپ کا شال بہت عمدہ ہے۔'' اُس مچھیرن نے میری بیوی سے رسمی طور پر کہا۔

'' آپ کے جسم پر یہ زیادہ اچھا لگے گا۔'' میری بیوی نے کندھے سے شال اُتار کر مچھیرن کے نہ نہ کرتے کرتے اُسے اُڑھا دیا۔

'' آپ کے اوڑھنے سے یہ شال اور زیادہ خوبصورت ہو گیا ہے۔''

''اگر ایسا ہے تو ہم مچھیروں میں ایک رسم ہے۔ وہ پوری کرنی ہوگی۔'' یہ کہتے ہوئے

مچھیرن اپنی جگہ سے اُٹھی اور میری بیوی کو اپنے مقابل کھڑا کر کے اُس سے کہا کہ اپنا آدھا شال اپنے سر پر ڈالو اور باقی آدھا میرے سر پر۔''

جب دونوں عورتیں اُس شال کے نیچے آ گئیں تو مچھیرن میری بیوی سے بغل گیر ہو گئی۔ اس طرح مچھیروں کی رسم کے مطابق دو اجنبی عورتوں کے درمیان دوستی اور محبت کا رشتہ استوار ہو گیا۔

یہ سب دیکھ کر میں پھر تصور کی دُنیا میں کھو گیا۔ اپنی گپھا کے باہر اُس عورت کے ساتھ ایک کیلے کے پتے کے نیچے کھڑے ہو کر جیسے ہم یہ رسم پوری کر رہے ہیں۔ کیلا ہم دونوں کے سروں کو چھو رہا ہے۔ پھر عورت نے شرماتے ہوئے میری کمر میں ہاتھ ڈال کر میری چھاتی پر سر ٹکا دیا اور ہم دونوں خوشبوؤں میں ڈوبے پیار محبت کے رشتے میں بندھ گئے۔ اُس وقت کے حسن کی ایک جھلک پھر سے دیکھنے کے لیے میں نے نظریں اُٹھا کر مچھیرن کی طرف دیکھا۔

ہو بہو وہی حُسن اُس کے چہرے سے چھلک رہا تھا۔ بلکہ اس سے بھی کئی گنا زیادہ۔

مچھیرن کی خوبصورت، سورگ سی بجی سجائی جھونپڑی کو چھوڑ کر آنے کا دل نہیں ہو رہا تھا۔ لیکن دوڑتے ہوئے وقت کو جلدی تھی۔ وہ ہمیں وہاں سے اُٹھنے کی یاد دلا رہا تھا۔

میں اور میری بیوی تو وسا کھاپٹنم کی ڈالفن پہاڑی کے پیچھے والے سمندر کے کنارے محض سیر کرنے گئے تھے۔ وہاں پہاڑی کی ڈھلان پر بنی مچھیروں کی اِس بستی کو دیکھا تو من میں اِس نئی دُنیا کو دیکھنے کی خواہش اُبھری اور ہم ٹہلتے ٹہلتے اُس مچھیرن کی جھونپڑی تک پہنچ گئے تھے۔

ہم چلنے کے لیے اُٹھنے لگے تو مچھیرن نے ہمیں ایک پل رُکنے کے لیے کہا۔ وہ ایک چھوٹی سی سیڑھی کی مدد سے جھونپڑی کے اندر بنی پرچھتّی کی چھت پر چڑھی اور اپنے لکڑی کے بکس سے کروشیئے سے بنا ہوا جالی والا بڑا سا رومال نکال کر لائی۔ رومال کے چاروں کناروں پر کوڑیاں، چھوٹی چھوٹی سیپیاں اور شنکھ بندھے ہوئے تھے۔ اُن کے بیچ میں کہیں چھوٹی چھوٹی گھنٹیاں بھی ٹنکی ہوئی تھیں۔

''یہ میں نے اپنے مچھیرے کے لیے بنایا تھا پچھلے سال۔ اب اس کے لیے اور بنا دوں گی۔'' یہ کہتے ہوئے وہ میرے قریب آئی اور میری بیوی سے کہا کہ اپنے ہاتھوں سے رومال کو ہم دونوں کے سر پر پھیلا دے۔

ایک پل کے لیے یہ رسم ادا کرتے ہوئے جب دو جسموں کی دھڑکن ایک ہوگئی تو اُس نے مسکراتے ہوئے رومال کو تہہ کیا اور میرے ہاتھوں میں تھما دیا۔

''یہ میری طرف سے بھینٹ۔'' اُس آدمی کو جو سپنوں کی خوبصورت دُنیا میں کھویا رہتا ہے۔'' اُس نے کہا۔ پھر وہ تھوڑا سا شرمائی، لجائی اور اپنے جملے کو پورے معنی دے دیئے۔''پریم بھینٹ۔''

میرے ہاتھوں میں پکڑی اُس پریم بھینٹ کی گھنٹیاں ہاتھ کے ہلنے سے ٹن ٹن بج اُٹھیں تو میرے منہ سے نکلا۔'' آپ کی یہ پریم بھینٹ میرے وجود میں ہمیشہ مٹھاس گھولتی رہے گی۔''

مچھیرن کے گھر سے باہر قدم رکھتے ہوئے میں نے سوچا۔ اسی پیار کے سمبندھ نے میری زندگی کے راستے سے اُس وقت کانٹے دار جھاڑیوں کو کاٹ کر پھول اُگائے تھے جب میں گپھا میں رہتا تھا۔ یہی پیار آج ہماری زندگی میں ٹن ٹن کرتا مٹھاس گھول رہا ہے اور یہی پیار آنے والی صدیوں میں زندگی کو خوبصورت بناتا رہے گا۔''

میں نے اپنے تصور کی آنکھ سے دیکھا۔ اب سے دوڈھائی ہزار سال بعد میں اور میری بیوی اس مچھیرن کی جھونپڑی کی طرف آرہے ہیں۔ وہ دروازے پر کھڑی ہے۔ پشت میں ٹھاٹھیں مارتا نیلا گہرا سمندر اور آسمان پر پھیلی گھنگھور گھٹائیں، اُس کے حُسن کو اپنے اندر سموئے پوری کائنات کو خوبصورت بنا رہی ہیں اور یہ تمام خوبصورتی مچھیرن کے جسم میں ڈھل کر ہمیں خوش آمدید کہہ رہی ہے۔

میں اور میری بیوی اُس مچھیرن کے گھر سے باہر آرہے تھے۔ لیکن ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ہم اُس کے ساتھ ایک اٹوٹ بندھن میں بندھے ہوئے ہیں۔

بندھن جو دورایوں کے باوجود قائم رہتا ہے۔ بندھن جو ماضی کے پتھر یگ سے شروع ہوکر آنے والے یُگ کے اُس دور تک پہنچتا ہے، جو وقت کا ہم سفر بن کر آگے ہی آگے بڑھتا رہتا ہے۔

ooo

آف سیزن

وہ دونوں دوست ڈرے ڈرے ہی جنگل میں داخل ہوئے تھے۔

تو چل نہ یار۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔

تو چل نہ یار۔ میں ہوں نہ تیرے ساتھ۔

وہ اِس طرح ایک دوسرے کا حوصلہ بڑھا رہے تھے۔

یوں ڈرنے کی بات بھی تھی۔ اس جنگل میں ایک سے ایک بڑھ کر خونخوار جانور موجود ہیں۔ شیر، بھیڑیے، چیتے تو خیر تھے ہی۔ ان کے علاوہ وہاں جنگلی بھینسیں پائی جاتی ہیں، جن کے بارے میں مشہور ہے کہ بڑی سے بڑی گاڑی کو بھی ٹکر ماردیں تو وہ اُلٹ کر چکنا چور ہو جائے۔ اور تو اور وہاں کے جنگلی کتے اور بھی خطرناک سمجھے جاتے ہیں۔ دوسرے جانوروں کے تو اپنے علاقے ہیں۔ وہ وہیں پر پائے جاتے ہیں۔ وہ بھی اکا دُکا۔ اس کے برعکس جنگلی کتے تو جوک در جوک سارے جنگل میں کہیں بھی گھومتے رہتے ہیں۔ ان کے خطرناک ہونے کی بھی وجہ ہے۔ ایک تو اُن کا جبڑا عام کتوں کے جبڑوں سے کافی بڑا ہے۔ وہ مُنہ کھولتے ہیں تو ایسا لگتا ہے جیسے مگرمچھ کی طرح اُن کا تیکھے تیکھے دانتوں سے بھرا جبڑا گلے تک کھلتا چلا جاتا ہے۔ انہیں دیکھ کر ہی آدمی ڈر جائے۔ دوسرے یہ کہ یہ لڑائی جھگڑے میں ہمیشہ پیش پیش رہتے ہیں۔ ان کے بارے میں بڑا دلچسپ واقعہ اس جنگل کے گائیڈ اکثر سیلانیوں کو سُنایا کرتے ہیں۔

ایک بار ہوا یہ کہ ایک شیر نے ایک جنگلی کتے کا شکار کرلیا۔ اُس کتے کے دوسرے ساتھی اس وقت تو دُم دبا کر نو دو گیارہ ہو گئے۔ لیکن دو چار دن بعد وہ ایک بہت بڑے گروہ میں

گئے اور شیر اور اُس کی شیرنی کو اُس کی کھوہ کے اندر ہی گھیر لیا۔ اُس دِن شیر جب شکار کے لیے کھوہ سے باہر نکلا تو اِن جنگلی کتوں نے بڑے بڑے دانتوں والے جبڑوں کو پھاڑ پھاڑ کر بھونکنا شروع کر دیا۔ شیر نے دو ایک بار ان پر حملہ کرنے کی کوشش کی تو ان سب نے مل کہ اپنے دانتوں میں اُسے جکڑ لیا۔ خیر شیر اِن کے چنگل سے نکل تو گیا، لیکن تب سے لوگ کہتے ہیں کہ شیر بھی ان سے کتراتے ہیں کہ ہاں! کون ان کتوں کے مُنہ لگے۔

ایسے جنگل میں داخل ہوتے ہوئے ان دونوں کا ڈرنا واجب ہی تھا۔ خاص طور سے اس لیے کہ یہ سیلانیوں کے آنے کا موسم نہیں تھا۔ سیلانیوں کے آنے کا موسم یہاں عام طور پر ہر سال سردیوں میں چھ مہینے کے لیے رہتا ہے۔ ان چھ مہینوں میں یہاں کافی گہما گہمی رہتی ہے۔ جنگل کے باہری گیٹ کے پاس بنے ہوئے ہوٹل یا جنگل کے اندر بنے ہوئے ہوٹل اور گیٹ ہاؤس سب کے سب بھرے رہتے ہیں۔ کئی لوگ تو کہتے ہیں کہ چونکہ یہ جنگل یہاں کے خونخوار جانوروں کی جھڑپوں کے لیے خاص طور سے مشہور ہے اس لیے ان چھ مہینوں میں وہاں ٹھہرنے کے لیے چار چار پانچ پانچ سال پیشگی نام درج کرانا پڑتا ہے۔

رہی آف سیزن کی بات تو ان دِنوں تو یہاں کے چوکیدار بھی اُونگھتے رہتے ہیں، ہوٹل تو خیر بند ہوتے ہی ہیں۔ اس لیے آف سیزن میں یہاں کوئی آتا جاتا نہیں۔ ان دو لوگوں کی طرح کوئی بھولا بھٹکا آ بھی جائے تو انہیں نہ تو اس سینکڑوں مربع میل جنگل میں گھومنے کے لیے کوئی گاڑی مل سکتی ہے اور نہ ہی کوئی گائیڈ، چوکیداروں کو بھی معلوم ہے کہ کوئی اکیلا دکیلا ایسے خطرناک جنگل میں داخل ہونے کی ہمت نہیں کرے گا۔ اِس لیے وہ لوگ کچھ لاپرواہ سے ہو جاتے ہیں۔

ایسے میں جب یہ دونوں جنگل میں داخل ہونے والے پھاٹک پر پہنچے تو دونوں چوکیداریوں، ہوش اور بے ہوشی کی بیچ کی کیفیت میں معلق تھے، جیسے نشہ ٹوٹنے کے بعد آدمی خود کو ادھر میں لٹکا ہوا محسوس کرتا ہے۔ ان کے جانے کے کافی دیر بعد ایک چوکیدار کو کچھ ہوش آیا تو اُس نے دوسرے سے کہا۔

''ایسا لگتا ہے۔ کوئی اندر گیا ہے۔''

''مجھے بھی کچھ ایسا احساس ہوا تو تھا۔''

''پھر''

پھر کیا۔ اگر ابھی تک وہ کسی پھاٹک سے باہر نہیں نکل گئے تو سمجھو لو کہ اب تک کوئی جنگلی جانور ان کی ہڈیاں نوچ چکا ہوگا۔

لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ یہ دونوں جب جنگل کے اندر گئے تو پہلے تو میلوں تک ایک خالی سڑک اندر چلی گئی، جس کے اوپر دونوں طرف سے گھنے پیڑوں کی ٹہنیوں کی اتنی گھنی چھت بنی ہوئی تھی کہ دھوپ کی کرنیں ہزار ہزار کوشش کے باوجود زمین تک نہیں پہنچ پا رہی تھیں۔ ہاں بندر اور لنگور ایک شاخ سے دوسری شاخ تک اور ایک پیڑ سے دوسرے پیڑ تک یوں کودتے پھر رہے تھے جیسے کسی نے اُن کو سرکس میں اچھل کود کے لیے تعینات کر رکھا ہو۔

اُس کے آگے گئے تو شتر مرغوں کا علاقہ آیا۔ انہوں نے اس آف سیزن میں آدمیوں کو دیکھ کر اپنی لمبی گردنیں یوں اُوپر اُٹھائیں جیسے راجستھان کی لڑکیاں سات گھڑے سر پر رکھ کر دھیرے دھیرے گردن سیدھی کرتی ہیں۔

اس کے بعد زیبرے، جنگلی مرغے، ہرنوں کی ڈاروں، جنگلی گھوڑوں کے علاقے سے وہ اطمینان سے گزرتے چلے گئے۔ صرف ایک جگہ یہ ہوا کہ دو موٹے موٹے سانپ ایک پیڑ پر لٹکے ہوئے دکھائی دیئے۔ دکھائی کیا دیئے۔ یہ تو بڑے اطمینان سے آگے بڑھ گئے تھے۔ اپنے پیچھے انہوں نے کچھ شاں شاں کی آوازیں سُنیں تو مُڑ کر دیکھا۔ دونوں سانپ ان سے ایک گز کے فاصلے پر پیچھے پیڑوں سے لٹکے پھنکارے مار رہے تھے جیسے کہہ رہے ہوں۔

''تمہیں ہم نے اس لیے نہیں ڈسا کیونکہ یہ ہمارا آف سیزن ہے۔

اس طرح وہ آگے بڑھے تو سامنے سے جنگلی بھینسوں کا ایک جھنڈ چلا آ رہا تھا۔

''اب کے مارے گئے'' ان میں سے کسی نے کہا۔

لیکن اس سے پہلے کہ وہ ان سے بچنے کی کوئی ترکیب سوچیں، وہ جھنڈ خود ہی کسی دوسری طرف کو چلا گیا۔

اسی طرح شیر کا سامنا ہوا۔ اس نے انگڑائی لی۔ اِن کو دیکھا اور پھر دوسری طرف کو مُنہ موڑ لیا۔

اور آگے ایک بھیڑیا اپنی مادہ کے ساتھی چہل کر رہا تھا۔ اُس نے ان دو آدمیوں کی طرف دیکھا۔ پھر اپنی مادہ سے کہا۔

''اچھے بھوجن کی ضرورت ہو تو پیش کروں۔'' لیکن اُس کی مادہ نے اُس کے مُنہ پر پیار سے اپنا پنجہ مارا اور پھر جہاں پنجہ مارا تھا وہاں ہلکے سے دانتوں سے کاٹ لیا۔ جیسے کہہ رہی ہو۔'' مجھے تو اس وقت تمہارے پیار کی بھوک ستا رہی ہے۔ تمہارے علاوہ مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔

اس طرح جنگلی کتوں کا ایک جھنڈ بھی جب اُن کے پاس سے لاتعلق ہو کر گزر گیا تو آخر میں دونوں آدمی جنگل میں ایک ایسی چوٹی پر پہنچے جس کے نیچے بڑی چوڑی اور گہری ندی بہہ رہی تھی۔

وہاں ایک اونچی چٹان پر کھڑے ہو کر دونوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں گہری نظر سے جھانک کر دیکھا۔

پھر اُن میں سے ایک نے کہا۔'' آج تو بچ گئے۔ لگتا ہے یہ جنگلی جانور آف سیزن میں کسی کو کچھ نہیں کہتے۔ ورنہ سانپوں کے جوڑے، شیروں بھیڑیوں اور جنگلی کتوں کے بیچ سے گزر کر بچ جانا آسان نہیں ہے۔'' ایسا کہتے ہوئے اُس نے سامنے کی طرف دیکھا جیسے دوسرے کا دھیان اُس طرف بٹانا چاہتا ہو۔

ابھی اس کا یہ جملہ پورا بھی نہیں ہوا تھا کہ اُسے زور سے دھکا لگا، اور وہ ہوا میں معلق نیچے بہتے دریا کی طرف گر رہا تھا۔

تمہارا یہ کہنا تو ٹھیک تھا کہ جنگلی جانوروں کا آف سیزن ہے۔ لیکن تم بھول گئے کہ میرا آف سیزن نہیں ہے۔ میں تو تمہیں ورغلا کر اس جنگل میں لایا ہی اس غرض سے تھا کہ تم سے اپنا حساب برابر کر لوں۔

○○○

گھاس کے پھول

بنجر اور پتھریلی زمین ہریاول کے سپنے نہیں دیکھتی۔

لیکن صبح جب وہ جاگا تو چنو کو لگا کہ جیسے کوئی خوشی اس کے دل کے کسی گوشے میں کلی کی طرح کھِل رہی ہو، اس کے تن بدن پر کوئی سکھ دستک دے رہا ہو۔

چنو کو اپنے آپ پر یقین نہیں آیا۔ یہ ایک ایسا احساس تھا جس سے وہ ساری عمر بے بہرہ ہی رہا۔ اب تک اگر کبھی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی بھی تو وہ ان لوگوں کی مرہون منت تھی جو اس کے سر پر چار جوتے مار کر بیگار لیا کرتے تھے۔

پہلے جوتے مارتے۔ پھر کہتے۔ ''چل بے اُٹھ۔ یہ چارپائی بن دے۔'' اور چارپائی بنتے بنتے مونج کی بنی رسی سے اس کے پپوٹے چھل جاتے، انگلیاں درد کرنے لگتیں۔ ہاتھوں میں ننھی چھلتریں چبھ جاتیں۔ اور تو اور بیٹھے بیٹھے گھٹنے جڑ جاتے، پنڈلیوں کی نسیں اکڑ جاتیں۔ نیچے کو جھکی ہوئی گردن تو اوپر اُٹھنے کا نام نہ لیتی اور سارے بدن کی تھکاوٹ جب آنکھوں میں اُتر آتی تو آنکھوں کے سامنے کالے کالے دھبے تیرنے لگتے۔

ایسے میں بے گار لینے والا اٹھا کر یا سیٹھ اگر اس کے بن دھلے ہاتھوں پر دو باسی روٹیوں کے اوپر اچار رکھ کر دے دیتا تو پیٹ کی آگ بجھنے پر جو تسکین ملتی ہے، اسے آپ سکھ تو نہیں کہہ سکتے نا؟

لیکن آج کی کیفیت مختلف تھی۔ آج صبح جاگنے پر اس کا منہ کسیلا کسیلا نہیں تھا، جیسا کہ اکثر رات کو کچی شراب پینے کے بعد ہوتا ہے۔ آج اسے بدبودار ڈکار بھی نہیں آیا،

جس سے منہ کا سواد بگڑنے پر وہ خود ہی اپنے آپ کو ماں بہن کی غلیظ گالی دیا کرتا تھا۔ نہ ہی صبح صبح نیچے سے سرکتی ہوئی آواز کی سیٹی بجی جس کی سڑاند اس کی اپنی ناک کے لیے ناقابل برداشت ہو جاتی ہے۔

اس کے برعکس ہوا یہ کہ سامنے سے چڑھتے ہوئے سورج کی ایک کرن ٹوٹی ہوئی دیوار کے ایک شگاف کے راستے اس کے ذہین پر بچھے بستر پر پہنچ کر اسے گدگدی سی کر رہی تھی اور اس کا من اپنے آپ اندر ہی اندر ہنسے جا رہا تھا۔ تبھی اسے شگاف کے اندر کی طرف ایک نئی چیز دکھائی دی۔ دراصل گھاس کی قسم کی ایک بیل جو دیوار کے باہر کہیں اتفاقیہ اگ آئی تھی، وہ شگاف کے راستے اندر کی طرف بڑھ آئی اور اب اس پر ایک ننھا سا جامنی سے رنگ کا پھول کھل آیا تھا۔

''پھول اور میری جھونپڑی میں؟'' اس کے اندر کی حیرانی ہونٹوں پر آتے آتے الفاظ میں ڈھل گئی اور وہ آنکھیں مل مل کر پھول کی طرف دیکھنے لگا۔ جیسے اسے اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہ آ رہا ہو۔

''آج تو کوئی اچھا ہی مہورت ہوا ہے گارو۔'' اس نے گارو یعنی شریمان کا لفظ اپنے لیے شاید زندگی میں پہلی بار استعمال کیا۔ نہیں تو آج تک دوسروں کے لیے یہ لفظ استعمال کرتے کرتے اس کی زبان تک گھس گئی تھی۔ ''دیا کرو گارو۔ رحم کرو گارو، تم دیوتا ہو گارو۔'' اور جب کبھی کوئی اس پر زیادتی کرتا تو اس کا دل کرتا تھا کہ اس لفظ کو ذرا سا بدل کر گالی بنا دے، لیکن ایسا کرنے کا کبھی اس کا ہیا نہیں پڑا تھا۔

یوں تو ابھی تک وہ اپنے گھاس پھوس کے بستر پر ہی لیٹا تھا لیکن آج اچھے مہورت کی وجہ سے چنو کو ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے بستر سمیت بلکہ جھونپڑی کی کچی دیواروں اور اس کی ٹوٹی پھوٹی چھت کے ساتھ آسمان میں اُڑا جا رہا تھا۔ چھت کے کچھ کھپریل اپنی جگہ سے کھسکے ہوئے تھے اس لیے چھت اکثر پریشان حال آدمی کی آنکھوں کی طرح ٹپکتی رہتی تھی۔ لیکن اس وقت فضاؤں میں اُڑتے ہوئے چھت کے انہی سوراخوں کے راستے سورج کی کرنیں روشنی کا آبشار بن کر اس کی جھونپڑی کو روشن کیے دے رہی تھیں اور اسے ایسا الگ

رہا تھا جیسے وہ کرنیں دُنیا بھر کے رنگوں کو بکھیر کر اس کی جھونپڑی کو بے حد خوبصورت بنا رہی ہوں۔ اسے لگا جیسے خوبصورت رنگوں نے اس کے گرد ہالہ بن دیا ہو۔

وہ بہت دیر تک ان رنگوں سے مالا مال ہوتی اپنی جھونپڑی کو دیکھتا رہا۔ دیکھتا رہا اور ان رنگوں میں سموئی خوبصورتی، گرمی اور خوشی کو اپنے جسم کے گھڑے میں بھرتا رہا اور جب یہ گھڑا پوری طرح بھر گیا تو اسے بنو کی یاد آئی۔ گاؤں کی نٹ کھٹ، البیلی اور چلبلی سی بنو جس نے ندی میں پانی کا گھڑا بھر کر اسے ندی کے اس پار سے آواز دی تھی۔ ''اے چنو ذرا گھڑا تو اٹھوا دو۔''

اسے اپنے کانوں پر یقین ہی نہیں آیا تھا۔

''بٹ بٹ کیا دیکھ رہا ہے میری طرف۔ دوڑ کے آ اور جلدی سے.....''

وہ دوڑ کر آیا تھا۔ ندی کے پاٹ کو پار کرتے کرتے وہ کمر تک بھیگ گیا تھا اور پھر گھڑا اٹھوا کر بنو چلی گئی تو وہ بت سا کھڑا اسے اس وقت تک دیکھتا رہا تھا جب تک وہ پیڑوں کے جھنڈ کی آڑ میں نہیں چلی گئی تھی۔

پھر اس کے بعد جب چنو کو ہوش آیا تو اسے اپنے اردگرد خوشبو سی پھیلی محسوس ہوئی۔ اس نے اپنے ہاتھوں کو سونگھا، جن سے اس نے گھڑے کو چھوا تھا۔ ان میں بھی خوشبو سی ہوئی تھی۔ پھر اس نے ریت کے اوپر بنو کے پاؤں کے دونوں نشان دیکھے اور اسے لگا جیسے بنو اب بھی وہیں کھڑی ہو۔ اس نے بیٹھ کر ان نشانوں کو غور سے دیکھا۔ وہ ریت تو جیسے بنو کے پاؤں کو اپنے اندر سمیٹے مخمل سی نرم اور کومل ہو گئی تھی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے ان نشانوں کو چھوا اور پھر نشے سے سرشار ہو کر پتہ نہیں کب وہ ان نشانوں کو سہلانے لگا۔

ہوش تو اسے تب آیا تھا جب نگینا چمار نے پیچھے سے آ کر اس کی پیٹھ پر لات جمائی اور اسے گردن سے پکڑ کر یوں سیدھا اُٹھا دیا جیسے ابھی ابھی مرے ہوئے بیل کو گردن سے پکڑ کر وہ اس کی چمڑی اُتار رہا تھا۔ بنو اور اس کے جسم کی خوشبو کے تصور کی جگہ اب مرے ہوئے بیل کے لہو کی بو اس کے جسم سے چپکی جا رہی تھی۔ نگینا چمار کے ہاتھوں پر لگا ہوا خون ابھی پوری طرح خشک نہیں ہوا تھا۔

''کب سے گہار لگا رہا تھا کہ یہ چمڑا اُٹھا کر میرے گھر لے جا۔ لیکن تو لاٹ ساب بنا سن ہی نہیں رہا۔ دھیان سے لے جانا۔ نہیں تو تیری چمڑی بھی بیل کی چمڑی کی طرح اُدھیڑ دوں گا۔'' نگینا چمار اس کے سر پر چمڑی کا گٹھر رکھ کر ندی میں اُتر گیا تھا۔

اس طرح اس کی خوشیوں کا خون ہونا ایک معمول تھا۔ عام سی بات۔ بیلوں کی چمڑی تو مرنے کے بعد اترتی تھی۔ اس کی کھال تو جنے کھنے کے ہاتھوں ہر روز اُدھڑتی رہتی تھی۔

لیکن اس وقت اس کی ذہنی کیفیت مختلف تھی۔ تھا تو وہی گھاس کا بستر، وہی ٹوٹی پھوٹی کچی دیواریں اور بڑے بڑے شگاف والی کھپریل کی چھت۔ لیکن اس وقت سورج کی کرنیں، خوشی کی روشنی بن کر اس کے اندر در آئی تھیں اور چنو خوشیوں کی رنگین چادر اوڑھے یوں لیٹا تھا جیسے اس کا گھاس پھوس کا بستر پھولوں کی نرم و نازک سی سیج بن گیا ہو۔

رنگوں کے اس مایا جال میں بنو پتہ نہیں کہاں سے آ گئی تھی۔ جسے مہوے کی خوشبو اس کے نتھنوں میں بھر گئی ہو پھر وہ ندی بھی اس کے اندر آ گئی جس کے کنارے بنو پہلی مرتبہ ملی تھی۔ چنو نے اپنی جھونپڑی پر آئی ندی کے کنارے کھڑی بنو کو اپنے ہاتھوں سے گھڑا اٹھوایا۔ ایک بنو چلی گئی تو دوسری بنو آ گئی۔ ہو بہو وہی شکل وہی صورت۔ پھر تیسری بنو پھر چوتھی۔ انگت بار بنو آئی اور ہر بار اسے گھڑا اٹھواتے ہوئے چنو کو ایک نئی لذت، نئی مسرت کا احساس ہوتا۔ اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ دل کا گھڑا کب کا بھر چکا تھا۔ اوپر سے چھلک چھلک جاتا تھا اور اس کا وجود تھا کہ خوشی سے بھیگ بھّبک جا رہا تھا۔ من ہی من میں چنو حیران بھی ہو رہا تھا کہ بنو تو ایک ہے۔ اس ایک سے اتنی ساری بنو کیسے بن گئیں۔

چنو انہی خیالوں میں گم تھا کہ بنو نے پھر اس کے کندھے پر زور سے ہاتھ مارا۔ ''کیا مورکھوں کی طرح جھونپڑی سے باہر دیکھ رہا ہے۔ چل گھڑا اٹھوا۔ کب سے آوازیں دے رہی ہوں۔ تو ہے کہ سنتا ہی نہیں۔''

فضاؤں میں اُڑتا ہوا جیسے وہ سپنے میں چونک پڑا۔ اسے اس طرح بوکھلاتے دیکھ کر بنو کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ بنو کو گھڑا اٹھواتے ہوئے چنو کو لگا جیسے وہ خوشی میں پوری طرح بھیگ گیا ہو۔ سرشار ہو گیا ہو۔

اتنے میں اس کی نظر شگاف میں چمکتے ننھے سے جامنی رنگ کے پھول کی طرف چلی گئی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس پھول نے بڑا ہونا شروع کر دیا۔ اس کی ننھی ننھی پتیاں، بڑی ہوتی ہوتی جھونپڑی کی پوری چھت پر پھیل گئیں۔ ''ارے کوئی پھول اتنا بڑا بھی ہوسکتا ہے؟'' اس کی آنکھیں حیرانی سے پھٹی جا رہی تھیں۔ ''نہیں کوئی پھول اتنا بڑا تو کبھی نہیں ہوتا۔'' چنو نے سوچا۔

پھر وہ جامنی رنگ کا پھول کنول کا پھول بن گیا۔ سفید رنگ کا کنول اور پھر اس کنول کے پھول کے اوپر وہ دیوی آ کر براجمان ہوگئی جس کی ہتھیلی سے سونے کے سکے بن بن کر متواتر برستے رہتے ہیں۔ چنو کے تصور کی آنکھوں کے سامنے جیسے ہی وہ دیوی آئی، جس کی تصویر اس نے کسی کیلنڈر میں دیکھی تھی، چنو نے اپنی جھولی پھیلا دی اور من ہی من میں سوچا کہ کیا ہی اچھا ہو اگر یہ دیوی اپنے جادوئی ہاتھ سے جھرنے والے سکے میری جھولی میں گرا دے۔

''لیکن میری جھولی بھرے گی کیسے؟ اس میں تو میری جھونپڑی کی چھت کے سوراخوں کی طرح چھید ہی چھید ہو رہے ہیں۔''

اتنا سوچ لینے پر بھی اس نے لاشعوری طور پر اپنے پھٹے ہوئے کرتے کی جھولی پھیلا دی۔

اس سے پہلے کہ دیوی کے ہاتھ سے جھرنے والے سکے اس کی جھولی میں گرنے شروع ہوتے، کوئی بھاری چیز دھپ سے اس کی جھولی میں گری اور اگر جھولی کے کونوں کو اس نے مضبوطی سے نہ تھاما ہوتا تو شاید.....

چنو کے تصور کی دُنیا اچانک ڈھے گئی۔ اس کی ہوا میں اُڑتی ہوئی جھونپڑی جیسے دھپ سے زمین پر آ گری ہو۔ اس نے ڈر کے مارے گھبرا کر سر اوپر اٹھا کر دیکھا۔ جھونپڑی کی چھت پہلے کی طرح برقرار تھی۔ چاروں دیواریں بھی موجود تھیں۔ دیوار کا وہ شگاف بھی جس میں جامنی رنگ کا ننھا سا پھول تھا۔ سب کچھ اپنی جگہ موجود پا کر اسے دل میں راحت محسوس ہوئی اور اس نے گردن نیچی کر کے جھولی میں دیکھا۔ بڑے بڑے پتلوں میں بندھا ہوا

کھانے کا بڑا سا پُڑا تھا۔ پوڑی، حلوہ، مٹر کے چاول اور سبزی، سب کچھ پتل سے جھانک جھانک کر اسے کھانے کی دعوت دے رہے تھے اور ساتھ ہی کھڑا تھا اس کا ساتھی منو، جس کے ہاتھ میں دو بوتل کچی شراب پکڑی ہوئی تھی۔

''میں بھی کہوں۔ مجھے اتنے اچھے اچھے سپنے کیوں آرہے ہیں؟ یہ سب کہاں سے مل گیا یار.....''

''ارے بھئی۔ یہ جو امیر لوگ ہیں نہ؟ جن کے پاس اس جنم میں جرورت سے جیادہ کھانے کو ہے۔ وہ اپنے اگلے جنم کے پراٹھے مانڈے پکّے کرنے کے لیے کبھی کبھی گریبوں کو بھر پیٹ کھلاتے ہیں۔''

''واہ ری دُنیا۔ کسی کو اس جنم میں بھر پیٹ روٹی نصیب نہیں اور کوئی اپنے اگلے جنم کا بھی ٹھیا کہیے بیٹھے ہیں۔''

اس دن ان دونوں نے خوب چھک کر پی۔ جم کر کھانا کھایا۔

کچی شراب کچھ زیادہ ہی کچی تھی۔ بنانے والے نے شراب کو تیز، زیادہ تیز کرنے کے لیے مسالے میں نوشادر کچھ زیادہ ملا دیا تھا۔ اس لیے شراب ان کے سر پر کچھ ایسی چڑھی کہ وہ جھونپڑی کے مٹی کے فرش پر مٹی ہو کر پڑے رہے۔ مٹی میں اور ان میں فرق صرف یہ تھا کہ وہ دونوں سانس لے رہے تھے۔ چار چھ گھنٹے بعد جب ان کو ہوش آیا تو بھی نشہ ابھی زور پر تھا۔ پھر بھی کچھ کچھ باتیں یاد آنے لگی تھیں۔ تبھی پتہ نہیں ان دونوں کو ایک ساتھ کیا یاد آیا کہ وہ ایک دوسرے کے گلے لگ کر رونے لگے۔ کچھ دیر بعد جب آنسو تھمے تو چنو نے منو سے پوچھا۔ ''تم روئے کیوں تھے؟''

''میں تو اس لیے رویا تھا کہ میں نے جو اتنا بہت سا کھانا کھا لیا ہے وہ ہضم کیسے ہوگا؟'' منو نے جواب دیا۔

''میں بھی اسی لیے رویا تھا کہ ٹھاکر صاحب نے ہمارے سر پر جوتے تو مارے نہیں اور ہم نے ان کے دئے ہوئے کھانے سے پیٹ بھر لیا۔ اب کیا ہوگا۔'' چنو تھوڑی دیر کے لیے رُکا اور پھر بولا ''ٹھاکر نے جوتے نہیں مارے اسی لیے کھانا کھا کر میرا پیٹ گابھن بھیڑ کی

طرح پھولا ہوا ہے۔''

گابھن بھیڑ کی تشبیہہ پر ان دونوں کو ہنسی آ گئی۔ اب کی انہوں نے ہنسنا شروع کیا تو پھر کتنی دیر تک ہنستے چلے گئے۔ ہنستے ہنستے چنو کی نظر بوتل میں پڑی باقی بچی شراب پر چلی گئی۔ اس نے بوتل اٹھائی۔ ایک گھونٹ اپنے منہ میں انڈیلی۔ دوسرا گھونٹ منو کے منہ میں ڈالا۔ اس طرح باری باری گھونٹ بھرتے انہوں نے پوری بوتل خالی کر دی۔

اب ان کا نشہ پھر پوری طرح جوان ہو گیا تھا نشے کے جوان ہوتے ہی انہوں نے باقی بچا کھانا بھی اپنے پیٹوں میں ٹھونس لیا۔ جب پورا کھانا ختم ہو گیا تو پتہ نہیں چنو کو کیا ہوا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر پھپھک پھپھک کر رونا شروع کر دیا۔

چنو کو روتا دیکھ کر منو نے سوچا۔ اسے بھی اپنے ساتھی کا ساتھ دینے کے لیے رونا چاہئے۔ لیکن اسے رونا نہیں آ رہا تھا۔ اسے خود رونا نہیں آ رہا تھا اس لیے اس نے روتے ہوئے چنو کو چپ کرانے کی کوشش کی۔ چپ کرانے پر بھی جب چنو چپ نہ ہوا تو منو کو بھی رونا آ گیا۔ اب کی رو رو کر جب دونوں کا دل ہلکا ہوا تو منو نے چنو سے پوچھا۔ ''یہ بتاؤ اب کی تم روئے کیوں؟''

چنو ایک ٹھنڈی سانس بھر کر بولا۔ ''رویا اس لیے کہ یار بے گار تو ٹھیک ہے۔ لیکن یہ ٹھاکر، یہ سیٹھ اور ان کی دیکھا دیکھی ہر جناں کھناں ہمارے سر پر جوتے کیوں مارتا ہے۔ اچھا کرو تو انعام میں جوتے پڑتے ہیں۔ کام پسند نہ آئے تو سزا میں جوتے پڑتے ہیں۔''

''وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن ہم گریب منئی کر بھی کیا سکتے ہیں؟''

''سچی بات یہ ہے۔'' چنو بڑا گمبھیر ہوتے ہوئے بولا۔ ''جب بھی ٹھاکر یا سیٹھ بے گار کے ساتھ جوتے مارتا ہے تو میرا دل کرتا ہے کہ اسی کا جوتا چھین کر اس کے سر پر تابڑ توڑ مارنا شروع کر دوں۔''

''لیکن ہمارے لیے ایسا سوچنا بھی کفر ہے، ورنہ دل تو میرا بھی کرتا ہے کہ سرو، سیٹھ کی گنجی کھوپڑی مار مار کر لال کر دوں۔''

کچھ دیر کے لیے دونوں خاموش ہو گئے۔ جیسے اس کفر کے ڈر سے ان کی روح کانپ

اُٹھی ہو۔ پھر کچھ سوچتے سوچتے چنو کا چہرہ چمک اُٹھا۔ ''آج ہمارے پیٹ پوری طرح بھرے ہیں اور ہمارا نشہ بھی جوبن پر ہے۔ آج ہم چاہیں تو.....''

''ہم کچھ نہیں کر سکتے۔'' منو بولا۔

چنو کو مسکراتے دیکھ کر منو مورکھ سا بنا اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر بولا۔

''چلو آج تو کسی نے ہمیں جوتے نہیں مارے'' منو جیسے کوئی دور کی کوڑی لایا۔

''آج نہیں مارے تو کیا ہوا۔ جندگی بھر تو مارتے رہے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے چنو پھر ہنس دیا۔ اب کی اس کی ہنسی میں زندگی بھر جوتوں کی مار سے ذلیل ہونے کا درد شامل تھا۔

پھر اس نے من ہی من میں جیسے کوئی فیصلہ کر لیا ہو۔

''چل اُٹھ۔ کھڑا ہو جا۔'' چنو نے ایک ولولے سے کہا۔

منو مورکھوں کی طرح اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''میری مان'' چنو بولا۔ ''میں تم کو ٹھاکر سمجھ کر جوتے مارتا ہوں۔ تو مجھ کو سیٹھ سمجھ کر جوتے مار لے۔''

اس تجویز پر دونوں ہنسے، خوب ہنسے اور پھر اس پر عمل کرنے لگے۔

''لے ٹھاکر''

''لے سیٹھ''

''ایک اور''

''ایک اور''

اب اتفاق ایسا ہوا کہ ٹھاکر اور سیٹھ کی چوپال میں جب پاؤں دبانے کے لیے ان دونوں کی طلبی ہوئی تو انہیں اپنی حضوری سے غیر حاضر پا کر وہ خود ہی ان کی تلاش میں، چنو کی جھونپڑی تک پہنچ گئے۔ وہ دیکھتے کیا ہیں کہ نشے میں لڑکھڑاتا ہوا چنو کھڑا ہوتا ہے اور ٹھاکر کو غلیظ گالی دیتا ہوا ''لے ٹھکر'' کہہ کر منو کے سر پر جوتا مارتا ہے۔ پھر منو کھڑا ہوتا ہے اور ''لے سیٹھ'' کہہ کر بھدی گالی کے بعد چنو کے سر پر دھم سے جوتا مارتا ہے۔

ٹھاکر اور سیٹھ دونوں میں یہ تماشہ دیکھنے کی تاب نہیں تھی۔ اس لیے بڑی خاموشی سے

اپنے اپنے سر سہلاتے ہوئے جوپال کی طرف لوٹ پڑے۔ دونوں مرے ہوئے سانپ کی طرح بس گھول رہے تھے، لیکن ان کی ہمت نہیں تھی کہ.....

رہی چنو اور منو کی بات۔

جب وہ ایک دوسرے کو جوتے مارتے مارتے پوری طرح تھک گئے تو چنو ہانپتا ہانپتا ہنستے ہوئے منو کو، دیوار کی درار سے چپکا ہوا جامنی رنگ کا ننھا سا پھول دکھا رہا تھا، جس نے چنو کے دن کو خوبصورت بنا دیا تھا۔ لیکن منو مور کھوں کی طرح منہ بائے سوچ رہا تھا کہ اس پھول میں بھلا کیا خاص بات ہو سکتی ہے۔

○○○

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے
ہیں مزید اس طرح کی شان دار،
مفید اور نایاب کتب کے حصول کے لئے
ہمارے وٹس ایپ گروپ کو جوائن کریں

ایڈمن پینل

عبداللہ عتیق : 03478848884

سدرہ طاہر : 03340120123

حسنین سیالوی : 03056406067

دل دریا

پہلے دن سے ہی مالن کی بے لوث خدمت اور محبت نے مجھے یقین دِلا دِیا کہ میں جلد ہی صحت یاب ہو جاؤں گا۔ وہ دِن بھر میرے چھوٹے چھوٹے کاموں میں مصروف رہتی۔ اُس کا کِسان شوہر بھی اپنے ہاتھ کے دس کام چھوڑ کر میری مٹھی چاپی کرتا رہتا۔ اُس کنوئیں پر مجھے اِتنا اپنا پن، اتنا پیار ملا کہ دو چار دن میں ہی اُس کنوئیں کا ذرّہ ذرّہ مجھ سے مانوس ہو گیا۔ اور تو اور اُن کا ڈبّو کتا جو اُس کنوئیں کے ساتھ لگے کھیتوں میں تو در کنار اُس کے پاس کے راستوں پر بھی کِسی اجنبی کے آنے جانے کو دوبھر بنا دیتا تھا، میرے آگے پیچھے دُم ہلاتا پھرتا تھا۔

یرقان ہونے کے بعد میں اپنے شہر سے اُس گاؤں میں صحت یابی کے لیے گیا تھا۔ شہر میں یہ بیماری قابو میں نہیں آ رہی تھی۔ ایک دفعہ ٹھیک ہوا تو کچھ دِن بعد یہ پھر عود کر آئی۔ دوسری بار جب ٹھیک ہوا تو کافی کمزور ہو چکا تھا۔ اب آنکھوں میں تو پیلا پن نہیں بچا تھا، لیکن میرا چہرہ ہلدی کی طرح پیلا پڑ گیا تھا۔ اپنے ناخنوں کی طرف دیکھتے ہوئے میرا دل بیٹھنے لگتا تھا۔ ایسے سفید ہو رہے تھے، جیسے اُن میں خون بچا ہی نہ ہو۔ ایسے میں ڈاکٹر کا مشورہ سن کر میرے ایک دوست نے مجھے اپنے گاؤں والے کنویں پر بھیج دیا، تا کہ وہاں کی تازہ آب و ہوا میں، ہری سبزیاں کھا کر جلدی صحت یاب ہو سکوں۔

سردیوں کے دن تھے۔ گاجر، مولی، سرسوں، پالک، گوبھی، شلجم، چنے، بینگن کیا نہیں تھا اُس کنویں پر۔ گنے کے کھیت۔ خود ہی جو دل چاہے توڑو اور کھاؤ۔ صبح کی تازہ ہوا، پگڈنڈیوں پر بکھرے شبنم کے موتی۔ دوپہر کو نرم اور گرم دھوپ، شام کے وقت الاؤ سے ملنے والی گرمی، پھر سب سے زیادہ مالن اور اس کے کسان شوہر کا وقت بے وقت میری ہر ضرورت

کا خیال رکھنا۔ انہوں نے مجھے اپنے مالک کا مہمان سمجھ کر مالک سے بھی زیادہ میری خدمت کرنی شروع کردی۔ صبح ہوتی تو مالن میرے لیے چھاچھ کا چھنّا بھر کر لے آتی۔ اُس پر تازہ نکالے ہوئے مکھن کا پیڑا تیر رہا ہوتا۔ وہ لسّی پی کر میں سیر کے لیے نکلتا تو مالن اپنے وفادار کتّے کو میرے ساتھ کردیتی۔ ''ڈبو۔ اِن کے ساتھ جاؤ۔ صاحب کو کوئی پریشانی نہ ہو۔''

ڈبو دُم ہلاتا ہوا میرے ساتھ چل دیتا۔ شبنم سے لدی گھاس بھری پگڈنڈیوں پر ڈبو میرے آگے آگے یوں چلتا جیسے میری راہنمائی کر رہا ہو۔ میں کسی پیڑ پر لگے ہوئے پھولوں کو دیکھنے یا توڑنے کے لیے رُک جاتا تو آگے آگے جاتے ہوئے ڈبو کے پاؤں بھی رُک جاتے۔ میں کسی گنے کے کھیت سے چوسنے کے لیے گنّا اُکھاڑنا چاہتا تو ڈبو وہاں بھی میری مدد کرتا۔ وہ کیاری میں جا کر کسی موٹے تازے گنّے کے پاس جا کر کھڑا ہو جاتا، جیسے بتا رہا ہو کہ اِسے توڑو۔ یہ گنّا زیادہ میٹھا ہوگا۔

واپس لوٹتا تو میرے کمرے میں رنگ برنگے پھولوں سے بھری ٹوکری رکھی ہوتی۔ کمرا مہک مہک جاتا۔

تھوڑا آرام کرنے کے بعد میں رہٹ کے کھلے پانی کے نیچے نہاتا۔ وہاں سے تازہ دم ہو کر لوٹتا تو مالن رسوئی میں اپنے پاس بیٹھا کر سرسوں کے ساگ پر گھی کی کڑچھی ڈال کر ناشتہ کراتی۔ ناشتے میں مکی یا باجرے کی روٹی کھلاتی جسے وہ توے سے اُتار کر اُپلوں کی دھیمی آگ پر سینکتی تھی۔ اِس لیے وہ روٹی خستہ بھی ہو جاتی، اور راکھ کی خوشبو بھی بھر جاتی۔ کھانے میں مزا آجاتا صبح کے وقت دوپہر کو، شام کو، رات کو اچھا کھانے پینے کے بعد دو ہفتوں میں ہی مجھے احساس ہوا کہ میرے ناخنوں میں لالی آرہی ہے۔ گالوں میں اُن دیسی گلابوں کی سی رنگت بھر رہی ہے جن کی خوشبو میں، میں دِن بھر نہایا کرتا تھا۔

اِس طرح آہستہ آہستہ میری صحت اچھی ہوتی چلی گئی۔ جیسے جیسے میں صحت یاب ہوتا جا رہا تھا ویسے ویسے میں دِل ہی دِل میں، مالن اور اُس کے کسان شوہر کا شکر گزار محسوس کر رہا تھا جن کی بے لوث خدمت نے میرے اندر نئی زندگی پھونک دی تھی۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی اُن کے کتّے ڈبّو کا بھی شکریہ ادا کرنے کو جی چاہتا تھا جو اپنی دُم ہلاتے ہلاتے قدم قدم

پر میرے ساتھ رہتا تھا۔ وہ تو یہ تک کرتا تھا کہ جب میں اُن کی حویلی کی کوٹھری میں سو رہا ہوتا تب بھی وہ باہر دروازے پر ہی بیٹھا رہتا اور میرے باہر نکلنے پر دُم ہلاتا چاروں ٹانگوں پر کھڑا ہو کر میرے پاؤں کو یوں سونگھنے لگتا جیسے وہ میری قدم بوسی کر رہا ہو۔

اِسی لیے اُن تینوں کے لیے میرے دِل میں ہمیشہ نت نئے لطیف سے جذبے جاگتے رہتے تھے۔ کبھی میں سوچتا کہ میں جانے سے پہلے مالن اور کسان کو موٹی رقم اِنعام کے طور پر دے جاؤں گا۔ کبھی سوچتا کہ میں اُن دونوں کو اپنے شہر کے گھر میں بلواؤں گا اور اُنہیں وہاں کی خوب سیر کراؤں گا۔

تھوڑے لفظوں میں کہوں تو میرے دِل کے دریا میں اُن تینوں کے لیے پیار کا جذبہ اُمڈ اُمڈ پڑتا تھا اور ہر لمحے صاف شفاف لہروں سے میرا وجود بھیگ بھیگ جاتا تھا اور مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میں اُن کے سامنے اپنے پیار کا اظہار کیسے کروں۔ اس کے لیے میرے پاس لفظ نہیں تھے۔ اور اگر تھے تو اُن کی خدمت کے تول کے مقابل ہلکے پڑتے تھے۔ اِسی لیے میں چاہتے ہوئے بھی اب تک کچھ نہیں کہہ سکا تھا۔

یہاں تک کہ میرے لوٹنے میں صرف دو دِن رہ گئے۔ میرے لوٹنے کی ساری تیاریاں شروع ہوگئی تھیں۔ کسان ایک دِن پانچ کلومیٹر دور ریلوے اسٹیشن پر جا کر میری گاڑی کی ٹکٹ لے آیا تھا۔ مالن نے میرے ساتھ لے جانے کے لیے مکی کا آٹا، تِل، گھر کا بنا ہوا گڑ اور شکر اور نہ جانے ایسی کتنی ہی چیزوں کی پوٹلیاں باندھ باندھ کر ایک تھیلے میں بھر دی تھیں۔

بھرے ہوئے گھڑے میں اور پانی بھر کر، بار بار اُوپر سے چھلکا کر ہی جیسے کوئی یقین کرنا چاہتا ہے کہ گھڑا واقعی لبالب بھرا ہوا ہے۔ یہی حال مالن اور اُس کے شوہر کا تھا جیسے جیسے میرے آنے کا وقت قریب آ رہا تھا، اُن کی خدمت کا جذبہ بڑھ رہا تھا۔

اگلی صبح مجھے چل دینا تھا۔ اُس دِن شام کو میں آخری بار کھیتوں کی سیر کو نکلا تو مالن بھی ساتھ ہولی۔ کتا تو خیر ساتھ رہتا ہی تھا۔ چلتے چلتے جب ہم ایکھ کے کھیت کے پاس سے گزرے تو مالن نے پوچھا۔ ''گنا چوسیں گے؟''

''اچھا تو نہیں ہے۔'' میرا جواب تھا۔

مالن شاید اپنی خدمت کے جذبے کے تکمیل چاہتی تھی۔ بولی۔ ''شہر میں ایسے گنے چوسنے کو کہاں ملیں گے۔'' اور اُس نے میری کلائی پکڑی اور سرسر کرتے لمبے لمبے گنوں کے پاس لے گئی۔

میں تو باہر ہی کھڑا رہا اور وہ میٹھے اور موٹے گنے کی تلاش میں دو تین قدم کھیت کے اندر چلی گئی۔ وہ ایک ایک گنا مجھے دِکھادِکھا کر پوچھ رہی تھی کہ کِس کو توڑے۔

وہیں کھیت کے باہر کھڑے کھڑے میری نظر پتہ نہیں کیسے، گنوں کی آڑ میں کھڑی مالن کے چہرے پر جم گئی اور میرے دِل میں یہ خواہش اُبھری کہ گنا چوسنے کے بجائے اِس عورت کے موٹے میٹھے ہونٹوں کا رس چوس لوں۔

میرے دِل دریا کی کگار سے تھوڑی سی مٹی کنارے سے ٹوٹ کر گری تھی اور میرے دل میں بہتے خیالات کے صاف شفاف، نرمل جل کی ایک لہر کو گدلا کر گئی تھی۔ میلا کر گئی تھی۔

اسی لیے میرے دل میں ایسا خیال اُبھرا تھا۔

ابھی میرے دل میں صرف یہ خیال ہی پیدا ہوا تھا۔ اُس پر عمل کرنے کے لیے میں نے اپنا قدم آگے نہیں بڑھایا تھا۔

تبھی پاس کھڑے ڈبُّو نے میرے ٹانگ کو اپنے دانتوں میں دبوچ لیا۔

''ارے ارے ڈبُّو۔ کیا کرتے ہو؟'' مالن ہاتھ میں پکڑا ہوا گنا لے کر ڈبُّو کو مارنے دوڑی۔ لیکن مجھے اِس کا ذرا بھی افسوس نہیں تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ جو کام میں کرنے جا رہا تھا اُسے روکنے کے لیے ڈبُّو نے جو کیا تھا، وہ ٹھیک ہی کیا تھا۔

اگلے دِن وہاں سے چلتے وقت مالن اور کسان بار بار گُستاخی کے لیے معافی مانگ رہے تھے۔ لیکن میری یہ ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ میرے دِل کا کتا مجھ سے جو گستاخی کروانے جا رہا تھا اُس کے لیے معافی مانگ سکوں۔

میرے اندر تو اُس کسان جوڑے کا شکریہ ادا کرنے کی ہمت بھی نہیں بچی تھی۔

○○○

سوکھے پتّے

انسانوں کا وہ قافلہ ایک پہاڑ کی تلہٹی پر رینگتا ہوا ایسی جگہ رُک رہا تھا جہاں اونچے اونچے پہاڑوں سے گھرا ہوا تمام منظر ٹھہرا ٹھہرا سا تھا۔ یگوں یگوں سے ٹھہرے ہوئے اس منظر میں کچھ حرکت تھی تو ہوا میں — وقت میں اور پانی میں — ہوا کے چلنے کا احساس پہاڑوں کے سینے پر جھومتے پیڑوں سے، وقت کے چلنے کا احساس پیڑوں کے پل پل لمبے ہوتے سایوں سے اور پرت در پرت زمین پر اترتے اندھیروں سے ہو رہا تھا۔ رہی پانی کی بات۔ پانی کا دوسرا نام ہی شاید حرکت ہے اس کے چلنے کا احساس کئی طرح سے ہو رہا تھا۔ دونوں طرف اونچے پہاڑوں کے بیچ سے گزرتے ہوئے دریا کا پانی پتھروں سے ٹکراتا، پاٹ کے بیچ پڑی چٹانوں کے اُوپر سے اچھلتا، آبشاروں اور پانی کی اَن گنت چھوٹی موٹی دھاروں کو اپنے اندر سمیٹتا، مسلسل شور مچاتا ایسے چلا جا رہا تھا جیسے کوئی گویا اپنے ہی سنگیت کی سرمستی میں ڈوب کر اپنے آپ میں کھویا وجد کی کیفیت میں اپنی سُدھ بُدھ کھو بیٹھا ہو۔

وہ دریا بھی اس وقت ایسی ہی ذہنی کیفیت میں تھا۔ جب قافلے والے اس کے کنارے والی تلہٹی پر دھیرے دھیرے رینگتے ہوئے رُک رہے تھے، تب دریا کو کوئی ہوش نہیں تھا کہ کون آیا ہے۔ لیکن اس کی لہریں چٹانوں سے ٹکرا کر اوپر کو اچھلتی ہوئی چھوٹے چھوٹے ذروں میں بٹ کر تلہٹی کی طرف یوں دیکھ رہی تھیں جیسے ان کے دلوں میں قافلے کے بارے میں تجسس ہو۔ کچھ بوندیں تو ہوا کے دوش پر سوار ہو کر قافلے کے ایک ایک آدمی کے قریب آ کر ان کو چھونے کی کوشش بھی کر رہی تھیں۔

دو پہاڑوں کی اونچی اونچی چوٹیاں سر جھکا کر اس تلہٹی کی طرف دیکھ رہی تھیں، جہاں

قافلے کے سب لوگ آ کر رُک گئے تھے۔

''کون آیا ہے؟'' ایک چوٹی نے دوسری سے پوچھا۔

''انسانوں کا قافلہ ہے۔'' دوسری نے جواب دیا۔

''یہ لوگ کتنے خوش قسمت ہیں جو ایک جگہ سے دوسری جگہ جا سکتے ہیں۔'' ایک چوٹی نے رشک سے قافلے والوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہماری طرح نہیں کہ ایک ہی جگہ پتھر بنے بیٹھے رہو۔''

''جو چلتے ہیں، آخر انہیں بھی ہماری طرح ٹھہرنا پڑتا ہے۔ رُکنا پڑتا ہے۔'' دوسری چوٹی نے پہلی چوٹی کو اپنے ہی حال میں خوش رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

تبھی اس کی نظر قافلے والوں سے ہٹ کر اس منظر میں رونما ہو رہے ایک عجیب سے کھیل کی طرف چلی گئی۔ پتھروں کے بیچ اُگے ہوئے ایک پودے پر لگا ہوا ایک پھول تیز ہوا میں اِدھر اُدھر ڈول رہا تھا۔ پودے کی ٹہنی کو ہوا جدھر لے جاتی پھول ادھر کو جھک جاتا۔ اب اِدھر، اب اُدھر۔ اب یہاں ہے، اَب وہاں۔

ایسے میں ایک ننھے سے پنکھوں والی تتلی اس پھول پر بیٹھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن وہ بیٹھ نہیں پا رہی تھی۔

ایسا نہیں کہ پہاڑ کی وہ دونوں چوٹیاں ہی تتلی اور پھول کے اس خاموش کھیل کو دیکھ رہی تھیں۔ ہوا تو اس کھیل میں اہم کردار ادا کر رہی تھی۔ دریا کا پانی بھی تھوڑی دیر کے لیے بھنور کی صورت وہیں آس پاس گھومنے لگا تا کہ آگے بڑھنے سے پہلے وہ یہ دیکھ سکے کہ تتلی پھول پر بیٹھ پاتی ہے یا نہیں۔ وقت بھی اس وقت جیسے پل دو پل کے لیے ٹھٹھک کر ٹھہر سا گیا تھا۔

آخر جب پہاڑ کی چوٹیوں کو احساس ہوا کہ تتلی تھک رہی ہے اور اندھیرا ہونے والا ہے تو انہوں نے تھوڑی دیر کے لیے ہوا کو روک دیا۔

ہوا کا زور کم ہوا تو تتلی رات گزارنے کے لیے پھول کے اندر سمٹ کر بیٹھ گئی۔ دریا کا پانی دل میں اطمینان لیے بھنور سے باہر نکل کر آگے بڑھ گیا۔ اتنے میں قافلے والے بھی تلہٹی کے پیڑوں تلے بستر بچھا کر آرام کرنے کے لیے لیٹ گئے۔

اور پہاڑوں کے بیچ گھرا ہوا، ٹھہرا ٹھہرا منظر بھی رات کے اندھیروں میں گم ہو گیا۔

اُس رات ہوا پل دو پل کے لیے ہی رُکی تھی۔ صرف اس لیے تا کہ تتلی کو رات گزارنے کے لیے پھول کے پتوں کا بنا ہوا نرم اور خوشبودار بستر مل جائے۔ جیسے ہی وہ تتلی آرام سے پھول کے اندر چھپ کر بیٹھ گئی، ویسے ہی ہوا کی رفتار پھر تیز ہو گئی۔ تیز بہت تیز۔ اتنی تیز کہ پیڑوں کے سُوکھے پتے کھڑ کھڑ کرتے ساری رات گرتے رہے۔ اتنے پتے گرے، اتنے گرے کہ تلہٹی پر سوتے ہوئے آدمیوں کے اوپر جیسے گرے ہوئے پتوں کی چادر بچھ گئی۔

اگلی صبح جب یہ منظر جاگا تو پہاڑ کی دونوں چوٹیوں نے آنکھیں کھولتے ہی نیچے تلہٹی کی طرف وہاں دیکھا جہاں آدمیوں کا قافلہ ٹھہرا ہوا تھا۔ سُوکھے پتوں کی چادر اوڑھے کچھ لوگ سو رہے تھے۔ کچھ لوگ آلس کے مارے لیٹے لیٹے ہی کروٹ بدل رہے تھے۔ اکا دکا اُٹھ کر اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔

پھر پہاڑ کی چوٹیوں نے اپنے قدموں تلے بہہ رہے دریا کی طرف دیکھا۔ دریا متواتر بہہ رہا تھا۔ وہی شائیں شائیں کرتا ہوا شور، جیسے اعلان کر رہا ہو، کہ دیکھو میں متواتر اُٹھتا رہتا ہوں، چلتا رہتا ہوں۔ اس بہاؤ میں آبشار گر رہے تھے۔ اِدھر اُدھر سے آتی پانی کی ان گنت دھاریں ننھی ننھی ندیوں کی صورت اس بہاؤ میں شامل ہو رہی تھیں۔ کئی جگہ اس دریا کے اوپر جھکی، پہاڑوں کی چٹانوں سے جمی ہوئی برف کی لڑیاں قطرہ قطرہ پگھل کر یا برف کی صورت میں ہی اس بہاؤ میں گر رہی تھیں۔ کئی جگہ سے زمین کے اندر سے پانی رس رس کر اس بہاؤ میں شامل ہو رہا تھا۔

غرض کہ سب کے سب اپنی ہستی مٹا کر بہتے ہوئے دریا کا حصّہ بن رہے تھے۔!!

اور وہ پہاڑ خاموشی سے اس کھیل کو دیکھ رہا تھا۔ یا آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ وہ منظر خود ہی اپنے آپ کو دیکھ رہا تھا، اپنے کھیل کا خود ہی تماشائی ہو رہا تھا۔ کھیل بھی کیسا نرالا تھا۔ پیڑوں کے وہ پتّے جو کل تک زندگی کا حصّہ تھے، آج اس وقت سُوکھے پتّوں کی صورت دریا کے بہاؤ میں یوں بہتے جا رہے تھے جیسے وہ بیتے ہوئے پل ہوں۔

بیتے ہوئے پل جو زندگی کے کھیل میں اپنا کردار نبھا کر اپنا فرض پورا کر کے صفحۂ ہستی سے اپنا نام ونشان مٹا کر چلے جا رہے ہوں۔

تلہٹی پر گرتے ہوئے سُوکھے پتوں کی موٹی تہوں کی طرف دیکھتے دیکھتے پہاڑ کی چوٹیوں کو اس تتلی کا خیال آ گیا، جس نے رات کو پھول کے بستر میں بسیرا کیا تھا۔ پتہ نہیں زور شور سے چلتی ہوا میں اس کا کیا ہوا۔ پہلے ان کی نظر اس پودے پر گئی۔ پودا اپنی جگہ قائم تھا۔ پودے پر لگا ہوا پھول بھی شبنم سے نہایا دھویا تر و تازہ اپنی خوشبو چاروں طرف بکھیر رہا تھا، اور وہ تتلی بھی رات آرام کرنے کے بعد اسی پھول کے گرد منڈلا رہی تھی۔

''زندگی کی کہانی اس پھول اور تتلی کی چھوٹی سی رُوداد میں سمٹ جائے تو دھرتی پر خوشبو ہی خوشبو بکھر جائے۔'' ایک چوٹی نے دوسری چوٹی کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

''کاش ایسا ہو۔ لیکن ایسا ممکن نہیں ہے۔'' دوسری چوٹی نے کہا ''زندگی کا نظام کچھ اور ہی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے دوسری چوٹی نے پہلی چوٹی کا دھیان تلہٹی کی طرف کھینچا جہاں انسانوں کا قافلہ جاگ کر اگلے سفر کی تیاری میں تھا۔

وہاں پہاڑ کے اوپر لگے پیڑوں سے جھڑنے والے پتوں کا رشتہ جس طرح کٹ گیا تھا، اسی طرح زندگی کے پیڑ سے ایک آدمی کا ناطہ ٹوٹ گیا تھا۔ جس طرح سوکھے پتے دریا کے بہاؤ میں بہتے ہوئے گم ہوتے جا رہے تھے، اسی طرح ایک آدمی وقت کے بہاؤ میں بہنے کے لیے سوکھا پتہ بن گیا تھا۔

ایک سُوکھا پتہ بہت سے پتوں سے ڈھکا ہوا تھا۔

کچھ لوگ اس کے گرد گھیرا ڈالے کھڑے تھے۔

''بڑا ہی شریف آدمی تھا۔ بڑا ہی نیک انسان۔'' کوئی آدمی مرنے والے کی زندگی کی روداد سُنا رہا تھا۔

پھر پاس کھڑے ہوئے لوگ بھی مرنے والے کے ساتھ ہمدردی جتاتے ہوئے ان کی زندگی میں آنے والی ایسی بہت سی کہانیاں سنانے لگے۔ ان کہانیوں کو پیڑ سُن رہے تھے، پہاڑ سُن رہے تھے، وہ ٹھہرا ہوا منظر سُن رہا تھا۔

وہ سب کی سب کہانیاں سُوکھے پتّوں کی طرح اُڑ کر وقت کے بہاؤ کا اس طرح حصّہ بن رہی تھیں جس طرح پہاڑ کے بیچ بہہ رہے دریا میں آبشاروں اور اَن گنت چھوٹے چھوٹے ندی نالوں کا پانی دریا میں گر کر ایک ہو رہا تھا۔

وقت کے بہاؤ میں مل کر مرنے والوں اور زندہ لوگوں کی ساری کہانیاں بھی ایک ہو کر سُوکھے پتّوں کی طرح بہی جا رہی تھیں۔

سُوکھے پتّے جو وقت کے دریا میں ڈوبتے اُبھرتے ریشہ ریشہ ٹوٹتے اپنی ہستی کھوتے جا رہے تھے۔

اس دلدوز منظر کو دیکھ کر پہاڑوں کے پتھر دل بھی پگھل پگھل کر، دریا میں گر کر سُوکھے پتّوں کی مانند بہتے جا رہے ہیں، بہتے جا رہے ہیں۔

سُوکھے پتّے بہہ رہے ہیں اور وہ ٹھہرا ہوا منظر اسی طرح زندہ ہے زندہ اور خوبصورت۔

○○○

سُہاگ رات

مکالوے آئی مالن اپنی سُہاگ رات کے لیے پھول توڑنے گئی۔ خوبصورت سی سج بیاہی مٹیار کو اپنی طرف آتا دیکھ کر باغ، باغ باغ ہو گیا۔ پھولوں سی لدی ٹہنیاں باز و لہرا لہرا کر اُس کی طرف بڑھیں۔ کلیاں ہنستے ہنستے کِھل اُٹھیں۔ پھول ہنستے ہنستے خوشبو خوشبو ہو گئے۔

ایک! پھولوں کی خوشبو۔

دوسرے! مالن کے تن کی خوشبو

ہوا ساری خوشبو کو اپنے اندر بھر کر خوش ہو کر رُکنے لگی تو وارث شاہ کے الفاظ میں کہوں تو کل جہان میں یہ خبر پھیل گئی کہ مالن اپنی سُہاگ رات کے لیے پھول چُننے کے لیے باغ میں آئی ہے۔

گلاب، چنبہ، چمیلی، نرگس، رات کی رانی..... کس کس بوٹے کا نام لوں۔ یہ سارے کے سارے مستی میں جھومتے آگے بڑھ بڑھ کر مالن کی طرف یوں جھک آئے جیسے اُسے بانہوں میں بھرنے کے لیے بے چین ہو رہے ہوں۔

مالن گلاب کی طرف جاتی تو گل داؤدی چار قدم آگے آ جاتی اور اُس کے پھول بڑھ چڑھ کر اپنے آپ کو پیش کرتے۔

کنواری کلیاں، مصری کی ڈلیوں میں ڈھلی شرما شرما کر ایک دوسری سے مذاق کرنے لگیں اور مالن کی جھولی میں جانے کے لیے اُتاولی ہو گئیں۔

بھنورے حیران۔ کدھر جائیں۔ ایک طرف پھولوں کی بہار، دوسری طرف مالن کے روپ کا نکھار۔ ایک طرف مخملی پھولوں کے نرم بستر کی ٹیک اور دوسری طرف مالن کے سانسوں کا سینک۔

مالن جیسے جیسے پھول چن چن کر جھولی بھرتی جائے ویسے ویسے وہ اور کی اور بنتی جائے پھول اُس کے جسم کے رنگ میں رنگتے جائیں اور مالن کے انگ پھولوں کے روپ میں ڈھلتے جائیں۔

آخر اُس کی جھولی بھر گئی اور مالن پوری کی پوری خوشبو بن گئی۔

الگ الگ پھولوں کی خوشبوئیں مل کر ایک ہو گئیں تو مالن کے تن میں رچ کر وہ کستوری بن گئیں۔

اس کستوری کی خوشبو جب ہرنی کے تن میں جاگتی ہے تو وہ انجانے میں پیار کا راگ الاپتی ہے۔ خوشبو بنی ہرنی کو اپنی ہی خوشبو کا کوئی سر انہیں ملتا۔ خوشبو کے نشے میں سرشار وہ اپنی ہی کستوری کو ڈھونڈتی اِدھر دوڑتی ہے، اُدھر بھاگتی ہے اور آخر کسی ہرن کے مایا جال میں جا پھنستی ہے۔

مایا جال اور کایا جال

یہ جال! اِس کی پکڑ بری۔

تیکھی چھری۔

یہ چھری انگ انگ کو کاٹتی چلی جاتی ہے۔

اندر ہی اندر دھستی چلی جاتی ہے۔

مالن کے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ ہوا۔ اُس کا تن کستوری میں ڈھلا تو اُس کے اندر الاؤ جل اُٹھا۔

اس کا سینک سورج تک پہنچا تو اُس کے دِل میں کوئی چنگاری دگ گئی اور اُس کے تن کو آگ لگ گئی۔

وہ بھاگا بھاگا آیا اور مالن کو دیکھ کر اُس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ من ڈگمگا گیا۔ ''مالن تو گوتم رِشی کی بیوی اہلیا سے بھی زیادہ خوبصورت ہے، جس کو دیکھ کر اندر جیسا دیوتا بھی مر مٹا تھا۔'' سورج نے اپنے دل میں ایسے سوچا اور مالن کے سامنے آ کر بولا۔

''مالنے۔ ری مالنے

تیرے روپ کی نہار

تیرے پھولوں کا نکھار
یہ تو بہار ہی بہار
اپنی جھولی کے پھول مجھے دے۔

مالن نے سورج کو سامنے دیکھ کر جلدی سے گھونگھٹ نکالا، اپنے روپ کو ڈھکا اور بولی:

سورجا! وے سورجا
میرے روپ کی نہار
میرے پھولوں کا نکھار
سب پیت پہ نثار
سوہاگ رات کے لیے انتظار کرے
مجھے میرا وے بھتار
جھولی کے پھول تجھے نہ دوں۔

لیکن مالن کو دیکھ کر سورج کا من تو مالن کے روپ میں اٹک گیا تھا اور اُس کے من میں ''کام'' کا لاوا پھوٹ پڑا تھا۔ وہ اپنی اندھی چاہ میں باورا ہو رہا تھا۔ اِس لیے اُس نے مالن کے انکار کو نہ سُنا اور اگر سُنا تو کسی گنتی میں نہ گنا۔

''ہوں! مرد کی اِچھا کے سامنے رِشی پتنی اہلیا بھی ہاری تھی۔ پھر بھلا یہ مالن کس کی بچاری ہے۔''

ایسا سوچ کر من نے تن کی آگ کو اور بھڑکا دیا اور سورج کو غلط راستے پر ڈال دیا۔ اُس نے اپنی خواہش کو پورا کرنے کے لیے اِندروالی چال چلی۔ مالی کا روپ دھارا اور مالن کے سامنے آ گیا۔

مالن اپنے مالی کو سامنے دیکھ کر تھوڑا لجائی، تھوڑا شرمائی اور بانہیں پھیلا کر اُس کے گلے لگ گئی۔

مالن اُس سے دِل بھر پیار کرتی جائے۔
دِل ہی دِل میں ہنستی چلی جائے
اور اُوپر اُوپر سے کہتی جائے

''دے تو اِتنا بے صبرا نہ بنتا

''تو میرا انتظار تو کرتا۔''

ایسے کہتے کہتے مالن سورج کو اپنا مالی سمجھ کر، اپنے رُوپ کا والی سمجھ کر اُسے گلے سے لگائے جائے اور اُس کی پیاس کو بڑھائے جائے۔

پھر مالن نے پھولوں سے بھری ٹوکری اُس کی جھولی میں پلٹائی، مند مند مُسکائی، ''تو پھول لیکر گھر چل۔ میں رہٹ پہ نہا کر تیرے پیچھے پیچھے آئی۔

مالن جلدی جلدی نہا کر تیکھے پاؤں چلتی گھر پہنچی تو مالن کی جھولی خالی دیکھ کر مالی کا سُہاگ رات کا چاؤ ادھورا ہی رہ گیا اور اُس کا دِل ڈھے گیا۔

اُس نے مالن سے پوچھا۔ پھول کیوں نہیں لائی۔ اپنے روپ کی ٹوکری کہاں بھول بھلا آئی۔

مالن چپ۔

کیا بولے۔

اُس کے ساتھ جو بیت گئی تھی اُس کا بھید کیسے کھولے۔

جب اصلیت دونوں کے سامنے آئی تو مالی بولا۔ ''مالنے آج اہلیا ایک بار پھر چھلی گئی۔ تُو تو چھلی گئی مالنے۔ 'تو تو چھلی گئی۔'' ایسا کہتے کہتے مالی اپنے آپ میں گم ہو گیا۔ پھر اپنے آپ سے باتیں کرتا کرتا کہتا جائے۔ ''اہلیا کا گھر والا تو مہارشی تھا۔ اُس نے تو اندر کو سراپ دے دِیا تھا..... اور میں..... اور میں..... میں تو معمولی مالی ہوں۔ میں تو تجھے چھلنے والے کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔''

مالی اپنے آپ میں ڈوبا پتہ نہیں خیالوں کے کس بہاؤ میں بہہ گیا اور پتہ نہیں کیا کیا کہہ گیا۔ اُس کی باتوں کو سُنتے سُنتے مالن کو سانپ کا زہر چڑھتا چلا گیا اور اُس کا تن اہلیا کی طرح پتھر بننے لگا۔

مالی نے مالن کو پتھر بنتے دیکھا تو اُس نے اُسے جھنجھوڑا۔ ''نہ مالن نہ۔ تم پتھر نہ بننا۔ اہلیا کو تو زندہ کرنے کے لیے رام آ گیا تھا۔ تمہیں زندہ کرنے کے لیے کون آئے گا۔''..... نہیں۔ نہیں۔ میں ہار ماننے والا نہیں۔ نہیں ہم ہار نہیں مانیں گے۔ سُہاگ رات تو ہمیں

منانی ہے۔ اِس بار تو گھر بیٹھ۔ باغ سے پھول توڑنے کے لیے میں جاتا ہوں۔

مالی جب باغ کی حد میں داخل ہوا تو پھولوں کے بوٹوں کے دِل میں ویسا ہی چاؤ پیدا ہوا۔ آج محنتوں کی قدر پڑھنے کا وقت آیا ہے۔ آج خالق خود اپنی تخلیق کا پھل لینے آیا ہے۔ پھولوں نے اُس کی خواہش پلک جھپکتے میں پوری کر دی۔ دیکھتے دیکھتے مالی کی جھولی اُوپر تک بھر گئی۔

پھولوں سے جھولی بھرتے ہی مالی کا جسم خوشبو میں ڈھل گیا اور اُسے دیکھ کر اُدھر سے گزرتی مینکا کا من مچل گیا۔

''وے میں سورگوں کی حور

وے میرا روپ بھرپور

تیرے پیار کے سُرور

مجھے کیا نور نور

تو میرا ہو مترا

وے مجھے پھولوں کی دے خوشبو مترا

ایسا کہتے کہتے مینکا مسکاتی جائے اور مالی کے نزدیک آتی جائے۔

''وے میرے من میں چاؤ۔

وے مالی سارے کے سارے پیار کے پھول

میری جھولی میں ڈالے جاؤ۔

جیسے جیسے مینکا آگے پیر بڑھائے۔ مالی پیچھے ہٹتا جائے۔ ساتھ ہی انکار میں سر ہلائے۔

مالن میرے دِل کی رانی

یہ پھول اُس کے پیار کی نشانی

آج رات ہے سہانی

ہم دونوں نے منانی

تو تو زنانی ہے بے گانی۔ تجھے پھول نہ دوں۔

مینکا کا من ٹوٹ گیا۔ ساتھ ہی اُس کے دِل سے غصّے کا لاوا چھوٹ پڑا۔

میرا روپ بے مثال
رِشی بھی اِس کی جھیل سکے نہ جھال
بھلا مالی کی کیا مجال۔

ایسا سوچتے سوچتے مینکا نے روپہلی چُنری ہوا میں لہرائی اور مالن کا روپ دھار کر مالی کے سامنے آئی۔

پھر چلے پر چڑھا کر اُس نے ''کام'' کا تیر چلایا تو مالن کو دیکھ کر مالی بے مہار بھاگا آیا۔

''ایسا بھی اُتاولا پن کیا ہوا۔
ری مالنے۔ تجھ سے انتظار نہ ہوا۔''

مینکا دِل ہی دِل میں ہنسی
اور اُس کے جا سینے سے لگی
مالی کیا جانے
اُس کے ساتھ ہو گئی ٹھگی۔

مالی کو خالی ہاتھ آتا دیکھ کر مالن کا دِل ڈھے گیا اور اُس کا سہاگ رات کا چاؤ وقت کے بہاؤ میں پانی کی طرح بہہ گیا۔

یہ کہانی کہنے کو مالی اور مالن کی ہے۔
لیکن یہ سب لوگوں کی ہے
یگوں پرانی ہے
سب کی جانی پہچانی ہے۔

مالی اور مالن اپنی زندگی میں سُہاگ رات کی خوشیاں لانے کے لیے اب بھی تانے بانے بُنتے ہیں۔ پھول اُگاتے ہیں۔ پھول چُنتے ہیں۔

لیکن سُہاگ کی رات ابھی نہیں آئی۔
سُکھ پر بھات ابھی نہیں آئی۔

○○○

ایک بُت پتھر کا

ایک تو بھری دوپہر کو ایسا لگے جیسے زندگی کی شام کا بیلا ہو۔ جیسے زندگی پر شام اتر آئی ہو۔ زندگی میں اندھیرا لانے والی شام۔

دوسرے چاروں طرف پسرا ہوا مخالف ہواؤں کا گھیرا۔

تیسرے دریا کے کنارے کی جان لیوا ٹھنڈ، ایسی کہ چولھے کی آگ کی لپٹیں توے کی طرف اٹھتی ہی ٹھنڈی ہوئی جاتی ہیں۔

ایسے میں روٹی سینکتی ہوئی پریشان ملاحن گلا پھاڑ پھاڑ کر تھک گئی مگر ملاح کے کان میں آواز نہیں پہنچ رہی۔

پتہ نہیں خیالوں کے کس بھنور میں اس کی ناؤ اٹکی ہے کہ اسے کچھ سدھ ہی نہیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ روٹی سینکو۔ بڑی بھوک لگی ہے...اب روٹی سک رہی ہے تو پتہ نہیں اس کی بھوک کہاں غائب ہوگئی۔

بے چاری ملاحن کو دنیاداری کی کچھ خبر نہیں۔ وہ یہ سمجھ ہی نہیں پا رہی کہ جب زندگی کی ناؤ بے اطمینانی کی لہروں پر تیرتی آگے بڑھنے کی کوشش کرتی ہے تو بڑے بڑے دِگج زندگی کی سدھ بدھ کھو بیٹھتے ہیں۔

ایسے میں پیٹ کی بھوک بھی انتڑیوں کے جال میں کہیں کھو جاتی ہے۔

ملاحن نے کھینچ کر ایک آواز دی۔

لہروں پر تیرتی ہوئی آواز ملاح کے کان تک پہنچی تو اس نے یوں محسوس کیا جیسے ملاحن اسے اس کے تصور کی دنیا سے باہر آنے کے لیے کہہ رہی ہو۔ اس کی بھوک پھر سے جاگ گئی۔

پھر بھی اس نے بڑی مشکل سے خود کو خیالوں کے بھنور سے باہر نکالا۔ بے من سے اٹھا۔ دریا کے پانی سے ہاتھ منہ دھویا اور ملاحن کے پاس آ کر بیٹھ گیا، لیکن کائی کے تنکوں کی چنگیر میں رکھی روٹی نہیں اٹھائی۔

خیالوں کی دنیا نے اسے پھر اپنی طرف کھینچ لیا تھا۔ اس لیے کھانا کھانے کے بجائے وہ بولا۔ تمھیں ایک کہانی سناؤں، بالکل سچی، آج ہی واپری ہے۔

''تمھاری کہانیاں مجھے نہیں بھاتیں''

لیکن میری ماں کے گیت کے بول تو تم اٹھتے بیٹھتے گاتی رہتی ہو، جو سب کہانیوں کی ایک کہانی ہے۔

''میرے دکھوں کو وہ روئے جو مجھے جانتا نہیں''۔

''تم بھی تو دوسروں کا دکھڑا رونے جا رہے ہو۔ مجھے تمھاری کہانی سے کیا لینا دینا۔ وہ میری بھوک تو مٹا نہیں سکے گی... چنگیر سے روٹی لو اور کھاؤ چپکے سے۔ تمھاری کہانیوں وہانیوں میں کچھ نہیں رکھا۔

ارے بھاگوان! دوسروں کے دُکھ رونے سے اپنے دُکھ ہلکے ہو جاتے ہیں، تم سنو تو سہی۔

اب تمھاری بھوک کہاں چلی گئی ہے؟

میری بھوک اس کہانی کے پیچھے کہیں گم ہو گئی ہے اور تم سنو گی تو... نہ نہ میری بھوک نہیں مرتی۔ مجھے تو کھانا کھانے کے بعد بھی ایسا لگتا ہے جیسے کھانا کھایا ہی نہیں۔ بھوک اپنی جگہ قائم رہتی ہے۔ اسی لیے اپنا کھانا کھانے کے بعد بھی تمھاری بچی کھچی روٹی بھی میں کھا جاتی ہوں۔

تب تو اس کہانی کو سننے کے بعد تمھاری بھوک اور چمک جائے گی۔ اس لیے ایک آدھ روٹی زیادہ سینک لو۔

لو۔ کہانی سنو۔

آج میں مچھلیاں پکڑنے گیا تو ایک لہر کو پتہ نہیں کیا سوجھی کہ وہ دوسری لہروں سے الگ ہو کر پتہ نہیں کس طرف چل دی۔ میری ناؤ اسی لہر پر سوار تھی۔ پانی کے اُس ویگ کے ساتھ

آگے بڑھتے بڑھتے میں نے دیکھا کہ وہ لہر میری ناؤ کو دھکیلتی ایک ایسے ٹاپو پر لے گئی، جسے میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ٹاپو کے ایک پتھر کے ساتھ ناؤ کو باندھ کر جب میں ٹاپو میں تھوڑا آگے بڑھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میرے قدم خود بخود ایک چٹان کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ جب میں اس چٹان کے قریب پہنچا تو میرے کانوں میں ٹھک ٹھک کی سی آواز پڑنے لگی۔

دراصل یہ ٹھک ٹھک کی آواز ہی مجھے اپنی طرف بلا رہی تھی۔ پاس جانے پر پتہ چلا کہ ایک پتھر گھاڑا ہتھوڑی چھینی کی مدد سے پتھر میں سے کوئی بت تراش رہا تھا۔ وہ اپنے کام میں اس قدر مگن تھا کہ اسے میری آمد کی کوئی خبر نہ ہوئی۔ میں بھی اسے بڑے انہماک سے کام کرتے ہوئے کافی دیر تک دیکھتا رہا اور اسے اپنی موجودگی کا احساس نہ ہونے دیا۔

وہ بت ایک عورت کا تھا۔

نہایت خوبصورت عورت کا۔

''دنیا کا ہر مرد اپنے ذہن میں اپنی چاہت کے مطابق ایک سے ایک خوبصورت عورت کے نین نقش گھڑتا رہتا ہے، وہ بھی کوئی تمھارے جیسا ہوگا''۔ ملاح نے چولہے میں ایک اور لکڑی رکھتے ہوئے ملاح کی طرف طنز بھری مسکراہٹ سے دیکھتے ہوئے کہا۔

خوبصورت عورت کا ذکر آتے ہی تم میری طرف شک بھری نظروں سے دیکھنے لگ جاتی ہو۔ بات تو میں پتھر گھاڑے کی کر رہا ہوں۔

ہاں تو وہ بت والی عورت نہایت خوبصورت تھی۔ لگتا تھا کہ قدرت خود پتھر گھاڑے کا روپ دھار کر اس عورت کو گھڑ رہی تھی۔ اس کے انگوں کو زیوروں سے ڈھک رہی تھی۔ اس کا سنگار کر رہی تھی۔

پتھر گھاڑا تو پتھر گھاڑا۔ میں دم بخود اس بت کی طرف دیکھ رہا تھا اور من ہی من میں سوچ رہا تھا کہ پتہ نہیں دریا کی لہر یہ بت دکھانے کے لیے مجھے اس ٹاپو پر کیوں لائی ہے۔

تبھی میرے کانوں میں کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔

میں نے پیچھے پلٹ کر دیکھا۔

وہ پتھر گھاڑے کی بیوی تھی۔ اپنے سر پر رکھی ٹوکری میں اس کے لیے کھانا لائی تھی۔ اس

نے میرے پاس آ کر روٹی کی ٹوکری کو ایک پتھر پر رکھا اور اپنے مرد کے بنائے ہوئے بت کی طرف دیکھتے دیکھتے وہ بھی جیسے پتھر کی ہو گئی۔

پتھر کا بت بنی اس کی بیوی کافی دیر تک پتھر کی مورتی والی عورت کی خوبصورتی میں کھوئی رہی۔

پھر اس کے اندر کی عورت جاگی" پتہ نہیں کس کلموہی کی مورتی بنا رہا ہے۔ اپنی بنائی ہوئی پتھر کی عورت کی خوبصورتی میں اس قدر مگن ہے کہ اسے اپنی ہاڈ مانس کی عورت دکھائی نہیں دیتی جو اس کے پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے روٹی بنا کر لائی ہے"۔

یہ کہتے ہوئے وہ پتھر گھاڑے کے پیچھے جا کر کھڑی ہو گئی۔ بت کو قریب سے دیکھتے ہوئے اسے لگا کہ جیسے اس عورت نے اس کے مرد کو چھین لیا ہو۔

تبھی اس نے دیکھا کہ پتھر گھاڑا اپنے ہاتھوں سے اس عورت کے گلے میں پہنے ہوئے زیور کو صاف کر رہا ہے۔ بازو بند کے ایک موتی کو چھینی سے رگڑ کر اس میں اور خوبصورتی پیدا کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

ہوں! موا کہتا ہے' مجھے تمھارے سوا دنیا میں کوئی اور عورت دکھائی نہیں دیتی۔ اور اب... اسے دیکھو...ہوں"۔

یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے پتھر گھاڑے کو شاید آواز دی تھی۔ شاید نہیں دی تھی۔ لیکن میں نے دیکھا کہ وہ پیر پٹختی ہوئی وہاں سے لوٹی اور جدھر سے آئی تھی ادھر چلی گئی۔ جاتے جاتے مجھے کہہ گئی کہ اگر اسے میری سوتن سے چھٹکارا ملے تو کہنا کہ یہ کھانا رکھا ہے۔ زہر مار کر لے"۔

کافی دیر بعد پتھر گھاڑا مورتی کے پاس سے اٹھا تو پتھر پر اپنا کھانا رکھا دیکھ کر وہ سمجھ گیا کہ اس کی بیوی ناراض ہو کر چلی گئی ہے۔

اس نے کھانے کی پوٹلی اٹھائی اور اس راہ پر تیز تیز بھاگنے لگا، جس پر اس کی بیوی واپس گئی تھی۔

میں اب بھی وہاں کھڑا کبھی بت کی طرف دیکھتا تھا اور کبھی اس راہ کی طرف جس پر دوڑتا ہوا پتھر گھاڑا اپنی بیوی کو منانے گیا تھا۔

تبھی وہاں پر ناپو کا شہزادہ آ گیا۔ اس کی نظر مورتی والی عورت کی طرف گئی تو اسے دیکھتے

ہی اس پر فریفتہ ہو گیا۔ اس مورتی کے ارد گرد گھومتے ہوئے اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ وہ شادی کرے گا تو اس عورت سے جسے دیکھ کر پتھر گھاڑے نے اس کی خوبصورتی کو اس بت میں اتار دیا ہے۔

ایسا سوچتے ہوئے اس نے اپنے اہلکاروں کو حکم دیا کہ اس بت کو اٹھوا کر محل کی طرف لے چلیں۔

''اچھا ہوا کہ وہ بت شہزادے نے اٹھوالیا ورنہ میرے گھر میں سوت لا کر بٹھا دیتے۔ وہ بت تم اٹھالاتے''۔

''بت تو کیا اگر میں اس عورت کو بھی اٹھالاتا تو وہ بھی تمھاری طرح ان حالات میں روٹیاں سینکتی تو اس کے حسن پر بھی غربت کی راکھ پڑ جاتی''۔

''ہاں! تو میں کہہ رہا تھا کہ شہزادہ جب بت کو لے کر اپنے محل کی طرف جا رہا تھا تو اس نے دیکھا کہ لوگ باگ اس بت کی طرف اشارے کرتے ہوئے آپس میں کھسر پھسر کر رہے ہیں۔ لوگوں کی ان باتوں کو سن کر اہلکاروں نے شہزادے کو بتایا کہ بت گھاڑے نے اس بت میں اپنی بیوی کی خوبصورتی کو نقش کیا ہے''۔

''ناممکن! اس بت کا حسن رانیوں مہارانیوں کے حسن کو تو کیا جنت کی حوروں کے حسن کو بھی مات دے رہا ہے''۔

''لیکن لوگ تو ایسا ہی کہتے ہیں''۔

''اگر یہ سچ ہے تو اس کے پاس ایسے زیور کہاں سے آئے، جن سے اس نے بت کا سنگار کیا ہے۔ کیا وہ ایسے زیور پہنتی ہے۔ یہ ست لڑا، ہاریہ، بازو بند، یہ کمر بند... ایسے زیور تو اس نے سپنے میں بھی نہ پہنے ہوں گے''۔

''وہ تو ٹھیک ہے، لیکن یہ بت ہے اس کی بیوی کا ہی'' وہاں اکٹھے ہوئے لوگوں میں سے کچھ نے ایک آواز ہو کر کہا۔ ''فرق صرف یہ ہے کہ ایسے زیور اس کے نصیب میں کہاں...''۔

شہزادہ یہ سب باتیں سن رہا تھا اور حیران ہو رہا تھا۔

''ہم اپنی آنکھوں سے اسے دیکھنا چاہیں گے''۔ شہزادے نے فرمان کیا۔ ''ان دونوں کو اسی وقت محل میں طلب کیا جائے''۔

پتھر گھاڑا اور اس کی بیوی جب شہزادے کے محل میں پہنچے تو شہزادہ کبھی پتھر گھاڑے کی بیوی کی طرف دیکھتا تھا تو کبھی اس کے بت کی طرف دیکھتا تھا اور حیران ہوتا تھا۔

''کیا آپ کی بیوی ایسے زیور پہنتی ہے جو آپ نے بت کو پہنا رکھے ہیں؟''

''نہیں حضور! ایسی قسمت ہماری کہاں؟ میں تو اس بت میں یہ زیور پہنا کر اپنے من کو خوش کر رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اگر اسے ایسے زیور پہنا دیے جائیں تو وہ کیسی لگے گی؟''۔

''تمھاری یہ خواہش ہم پوری کیے دیتے ہیں''۔

تبھی باندیاں آئیں اور انھوں نے وہ تمام زیور پتھر گھاڑے کی بیوی کو پہنا دیے تو اس کی بیوی خود حیران ہو کر کبھی شیشے میں اپنے عکس کو دیکھتی تھی اور کبھی اپنے پتھر گھاڑے کی بنائے ہوئے بت کی طرف۔ اسے پتہ ہی نہیں چل رہا تھا کہ ان دونوں میں کون ہاڈ مانس کی عورت ہے اور کون پتھر کی۔ بلکہ یہ ہو گیا تھا کہ حیرانی سے دم بخود ہاڈ مانس کی عورت پتھر کی بن گئی تھی اور پتھر کی عورت اپنے عکس کے لمس کو پا کر جیسے زندہ ہو گئی تھی۔

''پھر کیا ہوا۔ شہزادے نے جیسے سوچا تھا اس عورت کو پتھر گھاڑے سے چھین کر اپنی بیوی بنا لیا؟'' ملاح کی بیوی توے پر سینک رہی روٹی کو بھول کر کہانی کا انجام جاننا چاہتی تھی۔

لیکن ملاح پتہ نہیں پھر کن خیالوں میں گم ہو گیا تھا۔ اس کی ناؤ پھر کہیں بھنور میں پھنس گئی تھی اور وہ پورا تان لگا کر اسے وہاں سے باہر نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ زور زور سے پتوار چلا رہا تھا۔

''بتاؤ نہ کیا ہوا۔ تم تو ایسے گم ہو گئے ہو جیسے پتھر گھاڑے سے اس کی بیوی کے چھن جانے کے غم میں شریک ہو''۔

''نہیں بھاگوان۔ ایسا کچھ نہیں ہوا''۔

''تو پھر کیا ہوا تھا۔ جلدی بتاؤ۔ دیکھو میری روٹی جلی جا رہی ہے''

''ہوا یہ تھا بھاگوان کہ شہزادے نے جب پتھر گھاڑے کی بیوی کو جگمگ کرتے اصلی زیور پہنے ہوئے دیکھا تو اسے احساس ہو گیا کہ اس کے ملک کی عام سی عورت کے بدن سے غربت کی نیل کو جھاڑ کر اگر اس کا سنگار اصلی زیوروں سے کر دیا جائے تو اس کا حسن اس طرح جگمگا اٹھتا ہے کہ جنت کی حوروں کا حسن بھی اس کے سامنے پھیکا پڑ جاتا ہے۔

''تم پتھر گھاڑے کی عورت کے حسن کا راگ الاپ رہے ہو اور یہ نہیں بتا رہے کہ شہزادے نے اسے اپنی بیوی بنالیا تو بے چارے پتھر گھاڑے پر کیا گزری؟''

''بھاگوان تمھاری یہی عادت خراب ہے کہ ہر مرد میں عیب ڈھونڈنے لگتی ہو''۔

''ایک شہزادہ اپنی طاقت کے بل پر ایک غریب آدمی کی بیوی چھیننے کا ارادہ کیے بیٹھا ہے اور تمھارے نزدیک یہ عیب نہیں ہے''۔

''اپنی مارے جا رہی ہو۔ پہلے سن تو لو کیا ہوا''۔

شہزادے نے بہت سا دھن دولت اور وہ سارے زیور جو پتھر گھاڑے کی بیوی کو پہنائے تھے، ان دونوں کو دے کر وداع کرتے ہوئے یہ فیصلہ کیا کہ جب تک وہ اپنے عوام کے چہروں سے غربت کی میل نہیں دھوڈالتا، جب تک ان کے چہروں پر پتھر گھاڑے کی بیوی کا سا حسن دمک نہیں اٹھتا تب تک وہ چین سے نہیں بیٹھے گا۔

''یہ ہوئی نہ بات''

ملاحن روٹی سینک کر چنگیر میں رکھتی ہوئی ملاح کے قریب کھسک آئی اور بولی کہ ''یہ بتاؤ۔ ایسا وکرمادت ہمارے ہاں پیدا نہیں ہوسکتا۔

وِکرمادت تو اسی ملک میں پیدا ہوا تھا۔ آج بھی ایسے لوگ ہیں۔ لیکن مشکل یہ آن پڑی ہے کہ آج کے وکرمادت کے تخت پر جو پتلیاں جڑی ہیں ان میں سے کچھ کی ہوس بڑھ جاتی ہے تو ہمارے جیسے لوگوں کی طرف بڑھتی زندگی تو اندھیرے میں کہیں کھو جاتی ہے۔ ہماری زندگی میں اندھیرا لانے والی شام اتر آتی ہے۔

''جس دن زندگی کی لو میرے چہرے تک پہنچی اس دن تمھیں پتہ چلے گا کہ تیری ملاحن کتنی خوبصورت ہے''۔

''وہ تو مجھے پتہ ہے۔ اسی لیے تمھارے ہاتھ کی سینکی روٹی کو دیکھ کر میری بھوک بڑھ جاتی ہے''۔ یہ کہتے ہوئے ملاح نے ملاحن کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا اور چنگیر سے روٹی کا لقمہ توڑ کر ملاحن کے منہ میں رکھ دیا۔

○○○

بہاؤ

میں بڑے اطمینان سے گھر کے باہر کھڑا تھا کہ سامنے سے گائے بیلوں کا ایک جھنڈ آتا ہوا دکھائی دیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ سب جانور میرے سامنے سے ایک طرف مڑنے والے راستے پر آگے بڑھ جائیں گے۔ لیکن تبھی مجھے احساس ہوا کہ ایک نکیلے سینگوں والا طاقتور بیل میری طرف بڑھ رہا ہے۔ اس سے بچنے کے لیے پیچھے ہٹا تو وہ بیل گہری آنکھوں سے مجھے دیکھتا ہوا اپنے سینگ لہراتا میرے اوپر ہی چڑھا آ رہا تھا۔ میں کچھ اور پیچھے ہٹا تو پتہ نہیں اچانک میرے گھر کے پاس ایک ڈھلان سی کہاں سے نمودار ہوگئی۔ میں ڈھلان کی طرف مڑا تو وہ بیل بھی میری طرف مڑتا چلا گیا۔ اور پھر اس نے مجھے اپنے سینگوں پر اُٹھا کر اتنے زور سے اچھال دیا کہ میں کتنی دیر تک اوپر ہی اوپر جاتا رہا۔ جب میں ہوا میں معلق تھا تب میں نے دیکھا کہ میرے نیچے کی ڈھلان غائب ہے اور اس کی جگہ وہاں پر لمبا چوڑا دریا بہہ رہا ہے۔ اس کے گہرے پانی میں چھپ سے گرا تو پھر پتہ نہیں وہ بہاؤ مجھے کہاں سے کہاں بہا لے گیا۔

یہ سپنا لگتا ہے۔ مگر یہ سپنا نہیں تھا۔ یہ دراصل ایک واقعہ تھا، ایک حقیقت۔ جس سے میں زندگی میں دوچار ہوا تھا۔ جیسے ایک تنکا کسی آندھی، کسی طوفان یا زبردست بگولے میں پھنس کر خلا میں چاروں طرف بھٹکتا پتہ نہیں کہاں کا کہاں پہنچ جاتا ہے، بس وہی کیفیت میری تھی۔ اس دریا کے بہاؤ میں اپنا کوئی وجود نہیں، کوئی آواز نہیں۔ بہاؤ میلوں کی گہرائیوں میں نیچے لے گیا تو وہاں پڑا ہوں۔ دوسری کوئی لہر اپنے وجود میں سمیٹ کر چٹانوں سے ٹکرائی تو جیسے پانی کا قطرہ ایسے موقعوں پر کن کن ہو کر چاروں طرف بکھر کر اچھل

کر واپس لہر میں جا سماتا ہے۔بس وہی حالت اپنی تھی۔ بار بار ٹوٹا، بار بار بکھرا۔

ایسے میں ایک بار ایک ایسی لہر کے شکنجے میں پھنس گیا جو آگے کے بجائے دریا کی سطح کے نیچے نیچے پیچھے کی طرف دوڑی جا رہی تھی۔ مجھے تو پتہ ہی نہیں تھا کہ کدھر جا رہا ہوں، کیوں جا رہا ہوں۔بس پیچھے کی طرف جانا ہی میرے لیے آگے بڑھنے جیسا ہو گیا تھا۔ پھر وہ لہر جیسے اپنی کوکھ تک پہنچ گئی ہو، اپنے منبع تک۔ جہاں سے اس نے اپنا سفر شروع کیا تھا، وہاں تک۔

وہاں مجھے چٹان پر بیٹھا ایک آدمی دکھائی دیا ننگے بدن۔ وہ اپنے غمگین اور اداس چہرے کے ساتھ اپنے سامنے پھیلے دریا کی طرف دیکھ رہا تھا اور پتہ نہیں کیا سوچ رہا تھا۔

''تمہارے وجود پر غم کے بادل کیوں چھائے ہوئے ہیں۔'' میں نے پوچھا۔

پہلے تو وہ چپ رہا۔ پھر ڈوبتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''میں بہت ہی پرسکون اور خوشگوار ماحول میں رہ رہا تھا کہ ایک دن اچانک پتہ نہیں میرے دل میں کیا آیا کہ ایک ممنوع دانے کو چکھ لیا۔ بس اسی کی سزا کے طور پر وہاں سے نکال کر مجھے یہاں اس نئی دھرتی پر پٹخ دیا گیا ہے، جہاں چاروں طرف یہ دریا بکھرا پڑا ہے، اور اس کی لہروں کے جان لیوا تھپیڑے ہیں اور میں ہوں۔''

اس کی بات ابھی پوری ختم نہیں ہوئی تھی کہ جس لہر کے شکنجے میں، میں پھنسا ہوا تھا وہ شاں شاں کرتی ہوئی اس چٹان سے ٹکرائی، جس پر وہ آدمی بیٹھا تھا اور دوسرے ہی لمحے پانی کا بہاؤ مجھے اس آدمی سے دور، بہت دور لے گیا۔

واپسی پر وہ لہر بابل نام کے ایک شہر کے ساتھ جا ٹکرائی۔ بابل جسے دُنیا آج کل ببلونیا کے نام سے جانتی ہے۔ وہاں ایک یہودی سر پر چھوٹی سی ٹوپی پہنے دوزانو گرا توبہ کرتا ہوا آسمانی خدا کے سامنے گڑگڑا رہا تھا'' اے خدا میرے بزرگوں نے تمہارا حکم نہیں مانا اور سزا کے طور پر ہم اپنے ملک سے جلاوطن کر دیے گئے۔ اب ہم نسل در نسل جلاوطنی کی سزا بھوگ رہے ہیں۔''

گڑگڑاتے ہوئے اس کی حالت غیر ہوتے دیکھ کر مجھے یاد آیا۔ ایک بار ایسی نظم پڑھی تھی جس کا مفہوم یہ تھا کہ کبھی ہمارا بھی ایک ملک تھا۔ زمین کا نقشہ اُٹھا کر دیکھو تو وہ اب بھی

اپنی جگہ پر ملے گا۔لیکن اب ہم وہاں جانہیں سکتے۔

اس نظم کے آخری الفاظ سے ہجرت کرنے والوں کا جو درد ٹپ ٹپ کرتا متواتر ٹپک رہا تھا، وہ اس درد جیسا ہی ہے، جس کی جھلک میں نے چٹان پر بیٹھے ننگے آدمی کے چہرے پر دیکھی تھی۔

اس درد بھری چٹان سے تصور ہی تصور میں ٹکرا کر ایک مرتبہ پھر ٹوٹ کر کن کن بکھرتے ہوئے میرا دل بیٹھنے لگا اور میرا سارا جسم ٹھنڈے پسینے سے بھیگ گیا۔

وہاں سے اپنے آپ کو بڑی مشکل سے سمیٹا ہی تھا کہ اتنے میں میرا سامنا ہستنا پور کے شہزادوں یعنی پانچوں پانڈوؤں سے ہو گیا۔ گھنے جنگل میں چودہ برسوں کے جلاوطنی کی دُردشا جھیلتے جھیلتے ان کی بیوی دروپدی ان کے پیچھے اس طرح گھسٹ رہی تھی جیسے غریبی کی ریکھا کے نیچے چلتا ہوا کوئی آدمی چلتا ہے تو ایسے لگتا ہے جیسے زندہ لاش گرتے پڑتے چلی آرہی ہو۔

اس میں تو کوئی شک نہیں کہ وہ جوئے میں اپنے آپ کو ہار گئے تھے، لیکن ان کے چچا نے اس موقع کو غنیمت جانا اور اپنے بیٹے کو تخت و تاج کا وارث بنانے کے لیے انہیں چودہ برس تک جلاوطن کر کے در در کی ٹھوکریں کھانے کے لیے مجبور کر دیا تھا۔

ان کی اس مجبوری کی پھٹی پرانی چادر کو اوڑھے جب میں آگے بڑھا تو میں نے اپنے آپ کو انصاف پسند راجہ بکر ماد تیہ کے دربار میں پایا۔ کیا دربار تھا۔ وہاں عوام اونچی مسندوں پر مالک کی حیثیت سے بیٹھے تھے اور راجہ، اس کے وزیر اور اس کے اعلیٰ افسر اپنے مالک سے تنخواہ پانے والے جواب دہ ملازم کی حیثیت رکھتے تھے۔

میرے دیکھتے دیکھتے رعایا میں سے ایک عام سے آدمی نے اپنی مسند پر بیٹھے بیٹھے بکر ماجیت سے شکایت کی۔

''آپ کا شہزادہ فاتح کی حیثیت سے جب ہمارے علاقے میں داخل ہوا تو دارالخلافے اور اس کے گردونواح کے عوام کے ساتھ ان کی فوجوں نے ایسی زیادتیاں کیں کہ بہت لوگ اپنا گھر بار چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔''

راجہ کی جواب طلبی پر جب ان کا لخت جگر تسلی بخش جواب نہ دے سکا تو انصاف پسند راجہ نے اپنے بیٹے کو سات سال کے لیے جلاوطن کر دیا اور اسے اسی وقت ملک کی حدوں سے باہر نکل جانے کا حکم دے دیا۔

سر جھکائے ہوئے دربار سے باہر نکلتے ہوئے شہزادے کے پیچھے پیچھے میں بھی بکرماد تیہ کے دربار سے باہر آ گیا۔

اور آگے بڑھا تو مجھے ایسا لگا کہ جیسے کوئی درد بھری آواز میں مجھے بلا رہا ہو۔ کوئی گا رہا تھا، یا گاتا ہوا رو رہا تھا اور اس کی آواز مجھے اپنی طرف کھینچتی چلی جا رہی تھی۔ جب میں قریب پہنچا تو آنسوؤں سے بھیگی ہوئی آواز الفاظ کے جامے میں ڈھل کر میرے دل میں اترتی چلی گئی۔

کتنا ہے بدنصیب ظفر دفن کے لیے
دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

کوئے یار میں کوئے یار میں..... ان الفاظ کے درد میں ڈوبتے ہوئے بوڑھا قیدی بھاری قدموں سے چل رہا تھا۔ ایک دیوار سے دوسری دیوار تک۔ اور میں ہوش سے مدہوشی کے دُنیا میں داخل ہوتا ہوا سوچ رہا تھا۔ ''اس آدمی کو جلاوطن کیوں کیا گیا۔ اس کا جرم کیا تھا۔ اپنے تخت و تاج کو، اپنی حکومت کو سات سمندر پار سے آئے غیروں کے چنگل سے چھڑانے کی کوشش کو بغاوت کیسے قرار دے دیا گیا؟''

''ان سب لوگوں کو کسی نہ کسی سزا کی وجہ سے جلاوطنی کی سختیاں جھیلنی پڑی تھیں۔'' دُنیا کی تاریخ ہوا کے جھونکوں کی طرح آگے بڑھتی ہوئی مجھے بتا رہی تھی۔ میرے سوال کا جواب دے رہی تھی۔

آج جب میرا ذہن جلاوطنی کے ان واقعات کے ساتھ، اس قسم کی بہت سی دوسری جلاوطنی کی یادوں کے بوجھ سے دبا جا رہا ہے، وقت کے بہاؤ نے اچانک مجھے دریا کے پاٹ میں بکھری ریت پر ایسی جگہ کھڑا کر دیا جہاں میرے اندازے کے مطابق وہیں کہیں میرا گھر تھا۔

''کئی سال ہوئے گاؤں کا یہ حصہ راوی کی ڈوب میں آ گیا تھا۔'' کوئی مجھے بتا رہا تھا۔

تھوڑی دیر پہلے ہی قصبہ داؤد، تحصیل و ضلع نارووال کے اجڑے ہوئے بازار سے گزر کر میں ان اپنوں کے بیچ چلتا ہوا اس جگہ پہنچا تھا، جو اب غیر غیر سے لگتے تھے۔

میرے پاؤں کے نیچے بکھری ہوئی ریت، کھسک کھسک جارہی تھی۔ اور میں سوچ رہا تھا کہ میں نے تو کوئی جرم نہیں کیا تھا۔ نہ ہی کوئی ممنوع دانہ چکھا تھا، نہ کبھی جوئے میں اپنے آپ کو ہارا تھا، نہ ہی اپنے تخت و تاج کو پانے کے لیے غیروں سے بغاوت کی تھی۔

پھر مجھے یہ جلا وطنی کی سزا کیوں دی گئی۔

میں آنکھوں میں آنسو بھرے ڈب ڈبائی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھتے ہوئے سوال کر رہا ہوں۔

لیکن میرے سوال کا جواب کون دے گا۔ اجڑا ہوا گاؤں، دریا کا پاٹ، اس پاٹ کے پیچھے دور تک پھیلا ہوا سرکنڈوں کا جنگل۔

سب کے سب وقت کی طرح خاموش ہیں۔

میں نے نظریں اُٹھا کر دیکھا تو وہی نوکیلے سینگوں والا طاقتور بیل میری طرف اسی تیزی سے بڑھا اس نے مجھے اپنے سینگوں پر اٹھا کر پھر ہوا میں اچھال دیا۔ اور اب پھر دریا کے پانی میں چھپ سے گر کر وقت کے بہاؤ کا حصہ بنا، میں بہتا چلا جارہا ہوں، بہتا چلا جارہا ہوں۔

اور تو اور میں نے دیکھا کہ کاغذ پر بکھرے ہوئے میری اس روداد کے الفاظ پانی میں بھیگ کر آہستہ آہستہ پھیکے پڑتے جارہے ہیں۔ پھیکے پڑتے جارہے ہیں اور چہار سو بکھر رہے ہیں۔ جلا وطن ہو کر۔

○○○

روپ نگر کی گوری

میرے دِل میں خوبصورتی کے جو معیار ہیں وہ لڑکی اُس پر پوری نہیں اُترتی تھی۔ اس لیے امرتسر کے بس اڈے پر جب وہ میرے ساتھ ایک سیٹ پر بیٹھ گئی تو میں نے اُس کی طرف بس ایک بار نظر بھر کر دیکھا اور پھر اخبار کی باسی خبریں پڑھنے لگا۔

اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ وہ لڑکی اخبار کی باسی خبروں سے بھی گئی گزری تھی۔ ایسی بات نہیں۔ بس پہلی نظر میں وہ مجھے ایک عام سی لڑکی لگی اور میرے دل میں اُس کے لیے کوئی دلچسپی پیدا نہیں ہوئی۔

اُس کے آنے پر میں کھڑکی کی طرف یوں سمٹ کر بیٹھ گیا جیسے اُس کے آنے یا نہ آنے سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑا۔ جیسے وہ کوئی جوان لڑکی نہ ہو، کوئی بھی ایسا مسافر ہو جو تھوڑی دیر ایک اجنبی کی طرح آپ کا ہم سفر بنتا ہے اور پھر اپنی منزل آنے پر اجنبی کی طرح اُٹھ کر چل دیتا ہے۔ اور ہم اُسے یکسر بھول جاتے ہیں۔

اتنے میں کنڈکٹر آ گیا اور اُس نے چندی گڑھ کی ٹکٹ لی۔ اس پر بھی میرے دل میں کوئی جذبہ نہیں جاگا کہ چلو ہم ایک ہی منزل کے مسافر ہیں اور ایک جوان لڑکی کے ساتھ میرا سفر خوشگوار رہے گا۔

امرتسر سے چندی گڑھ پہنچنے میں بس پانچ چھ گھنٹے لیتی ہے اور یہ کافی لمبا وقت ہوتا ہے۔ خاص طور سے اُس وقت جب آدمی کے پاس کرنے کو کچھ نہیں ہوتا۔ بس اخبار پڑھتے رہو۔ یا کھڑکی سے باہر پیچھے چھوٹتے مناظر کو تکتے رہو۔ یا پھر بس کے اندر اُن مسافروں کے چہروں کی طرف بار بار دیکھتے رہو، جو آپ کے لیے کسی طرح بھی دلچسپ نہیں ہوتے۔

میں بھی سارا راستہ یہی کرتا رہا۔

ایک پیڑ کی شاخ پر ایک پرندہ بیٹھا تھا۔ میرے دیکھتے دیکھتے فضا میں اڑتا ہوا ایک پرندہ آیا اور پہلے پرندے والی شاخ پر آ کر بیٹھ گیا۔ نئے آنے والے پرندے نے پہلے پرندے کی طرف دیکھا، پھر اپنی چونچ کو ٹہنی پر رگڑا اور پھر دوسرے ہی لمحے اُس نے پنکھ تولے اور پھر ہوا میں اُڑنے لگا۔ پہلے سے بیٹھا ہوا پرندہ بالکل بے نیاز سا بیٹھا رہا۔ اُس نے اُسے یہ کہنے کی بھی ضرورت نہ سمجھی کہ اگر تمہیں میرا ساتھ پسند نہیں تھا تو تم اُس شاخ پر آ کر بیٹھے کیوں، جس پر میں بیٹھا تھا۔ کسی اور جگہ بیٹھ جاتے۔ پیڑ پر ایک نہیں سینکڑوں شاخیں ہیں۔

اس لڑکی کی طرف میرا رویہ بھی شاخ پر بیٹھے پہلے پرندے جیسا تھا۔ بس اپنا سفر طے کرتی رہی۔ بیچ میں ایک جگہ رُکی۔ وہاں بھی مسافر اُترے۔ کسی نے چائے ناشتہ لیا۔ کسی نے ٹھنڈا پیا۔ کسی نے کھانا کھایا۔ اس دوران میں نے اُس لڑکی کو ایک بار نہیں کئی بار دیکھا۔ ہر زاویئے سے دیکھا اور ہر بار وہ مجھے عام سی لڑکی ہی لگی اور میرے اندر اُس کے لیے کوئی بھی جذبہ پیدا نہ ہو سکا۔ یہاں تک کئی موڑ مڑنے پر یا اچانک بس کے بریک لگنے پر کئی بار اُس کے نرم بازو یا کندھا میرے ساتھ چھو گیا۔ جوان لڑکی کے جسم کا لمس پا کر ایک مرد کے اندر کئی جذبے جاگ جاتے ہیں۔ اور نہیں تو کم از کم آسودگی، تو حاصل ہوتی ہی ہے۔ چاہے آدمی اُس سے لطف اندوز ہو یا نہ ہو۔ لیکن کچھ بھی نہیں ہوا۔ بس، میں اُس پرندے کی طرح بے نیاز بیٹھا رہا جس کے پاس ہوا میں اُڑتا ہوا ایک پرندہ آیا تھا اور ٹہنی پر اپنی چونچ رگڑ کر پھر آسمان کی وسعت میں پرواز بھر گیا تھا۔

ایک بار میرے دل میں یہ خیال آیا کہ پاس بیٹھی ہوئی لڑکی سے اس طرح غیر تعلق رہنا اور اُس سے کوئی بات نہ کرنا اُس کے حسن کی نہیں تو اُس کی ذات کی توہین ہے۔ یہ مغرب نہیں ہے، جہاں دو آدمی گھنٹوں ایک ساتھ رہنے کے باوجود ایک دوسرے کے لیے اجنبی رہتے ہیں۔ یہ مشرق ہے۔ جہاں چند لمحوں کا ساتھ بعض اوقات عمروں پر پھیل جاتا ہے۔ اس لیے مجھے اس سے کوئی بات کرنی چاہیے۔ لیکن پتہ نہیں کیوں، میں یہ سوچ کر بھی

بے تعلق بنا رہا۔

بس آگے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ذمین، آسمان سب کچھ پیچھے کی طرف دوڑ رہے تھے۔ اور ساتھ ہی پیچھے کی طرف سرک رہے تھے، مختلف گاؤں، نگر، نئے نگر نئے گاؤں تیزی سے قریب آتے تھے اور پھر طے کیے ہوئے راستے پر کہیں پیچھے چھوٹتے چلے جاتے تھے۔

میں اپنے ہی خیالوں میں گم کھڑکی سے باہر کی طرف دیکھ رہا تھا کہ اچانک میری نظر ایک بورڈ پر پڑی۔ لکھا تھا۔

''روپ نگر آپ کا سواگت کرتا ہے۔''

کسی گاؤں کا یہ نام ''روپ نگر'' مجھے بے حد پسند آیا، اور دِل میں خیال آیا کہ جس گاؤں کا نام اتنا خوبصورت ہے، اُس گاؤں کی ہر چیز نہایت خوبصورت ہوگی۔ گورمکھی لپی میں اس بورڈ کو پڑھ کر میری نظر اُس گاؤں کی فضا میں دور تک پھیلتی چلی گئی۔ جیسے ہر طرف حسن ہی حسن بکھرا ہوا تھا۔ کھیت، کھیتوں میں اُگی فصلیں اُن کے کنارے لگے پڑے، پیڑوں کے اوپر جھکا آسمان، آسمان کے نیچے دھرتی پر بکھری ہوئی زندگی جیسے وہ زمین کا ٹکڑا ایک خوبصورت تصویر کی صورت نہایت خوبصورت فریم میں جڑا ہوا تھا۔

اُس خوبصورت تصویر کو دیکھتے دیکھتے اچانک میں نے اپنے بازو میں، اُس لڑکی کے بازو کی نرمی کو اُس کے گداز بازو کی گرمی کو اپنے اندر سرایت کرتے ہوئے محسوس کیا۔ مجھے ایسے لگا کہ جیسے کسی خوشبوؤں کی باڑی کے پاس سے گزر رہا ہوں۔ میں نے جلدی سے باہر دیکھا۔ نہیں! باہر تو کوئی باغ کوئی پھولوں کی باڑی نہیں تھی۔

''اوہ یہ خوشبو تو اس لڑکی کے جسم سے آ رہی ہے، جو میری سیٹ پر میرے ساتھ سٹ کر بیٹھی ہے۔'' میں نے ایسا محسوس کرتے ہی فوراً پلٹ کر اُس لڑکی کی طرف دیکھا، تو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ میں سوچ میں پڑ گیا۔ میرے پاس یہ کوئی عام سی پنجابی لڑکی بیٹھی ہے یا اندر کے دربار کی اپسرا۔ میں نے دیکھا۔ اُس لڑکی کا انگ انگ جیسے پھول کی طرح کھل اُٹھا تھا، مہک دے رہا تھا، اور میں خوشبوؤں میں نہایا ہوا ایسا محسوس کر رہا تھا کہ مجھے بے حد خوبصورت لڑکی کا ہم سفر ہونے کی خوشی حاصل ہو رہی ہے۔

''کیا یہ روپ نگر ہے،'' میرے کانوں میں جل ترنگ سی آواز گونج رہی تھی۔ مجھ سے یہ سوال اُسی نے پوچھا تھا۔

''ہاں! یہ رُوپ نگر ہے۔ میں نے اُس کے روپ کی لہروں میں ڈوبتے اُبھرتے ہوئے کہا تھا۔

بس اپنی رفتار سے سڑک پر بھاگی جا رہی تھی۔

تبھی میری نظر سڑک پر لگے بورڈ پر گئی۔ ''روپ نگر آپ کے آنے کے لیے شکر گزار ہے۔''

یعنی اب ہم رُوپ نگر کی سرحد سے باہر نکل آئے تھے۔

میں نے نظر اُٹھا کر اپنے ساتھ بیٹھی لڑکی کی طرف دیکھا۔

اِندر کے دربار کی اپسرا غالباً پیچھے رُوپ نگر میں ہی رہ گئی تھی۔

اب میرے ساتھ وہی عام سی معمولی نین نقش والی لڑکی بیٹھی تھی جو امرتسر میں بس پر سوار ہوئی تھی۔

○○○

یقین نہیں آتا

نیزہ بردار حبشی چاروں طرف سے گھیرے پتہ نہیں مجھے کہاں لے جا رہے تھے، اور مجھے اپنی جان کے لالے پڑ گئے تھے۔

میں اپنے ایک افریقی دوست کی دعوت پر افریقہ کے جنگلوں میں بھانت بھانت کے پکشی دیکھنے کے لیے گیا تھا۔ چار دِن اچھے گزر گئے۔ افریقہ کے جنگل بہت گھنے ہیں۔ اُن میں نئے نئے پکشی دیکھنے کو ملے۔ بھانت بھانت کی چہچہاہٹ سُننے کو ملی۔ اُن میں کئی پرندوں کی آوازیں تو ایسی لطیف تھیں کہ لگتا تھا جیسے پکشی نہیں قدرت خود پیڑوں کی ٹہنیوں پر بیٹھی زندگی کا راگ الاپ رہی ہو۔

وہاں بے حد گھنے جنگلوں میں پیڑوں کی شاخیں دوسرے پیڑوں کی شاخوں سے یوں اُلجھی ہوئی تھیں جیسے کرۂ عرض پر پڑوسی ملکوں کی حدیں ایک دوسرے ملک کی حد میں یوں دھنستی چلی جاتی ہیں کہ یہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ کس ملک کی حد کہاں ختم ہوتی ہے اور کہاں دوسرے ملک کی حد شروع ہو جاتی ہے۔ ایسے میں وہاں پکشیوں کی آوازیں تو مجھ تک پہنچ جاتی تھیں لیکن اُن کو اچھی طرح دیکھ پانا اتنا ہی مشکل تھا جتنا جنگل کی حد کا تعین کر پانا۔

اسی وجہ سے یہ سانحہ ہو گیا۔

ایک دِن میرے دوست کچھ بیمار تھے۔ اِس لیے میں اکیلا ہی نکل پڑا۔ سوچا تھا کہ جنگل کے گیسٹ ہاؤس کے آس پاس ہی رہوں گا۔ تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ ایک رنگ برنگی چڑیا ٹہنیوں پر پھدکتی ہوئی دِکھائی دی۔ اُسے قریب سے دیکھنے کے لیے من مچل اُٹھا۔ لیکن وہ ایک جگہ بیٹھتی ہی نہیں تھی۔ کبھی اس شاخ پر کبھی اُس شاخ پر دُم ہلاتی پنکھ پھڑ پھڑاتی گھنے پیڑوں

کی آپس میں گلے ملتی ٹہنیوں کے بیچ مٹکتی ہوئی وہ تو آگے ہی آگے جا رہی تھی۔ لیکن میرے لیے اُس کا پیچھا کرنا نہایت مشکل کام تھا۔ کبھی گردن میں لٹکا ہوا کیمرا اور کبھی جنگلی جانوروں سے اپنی حفاظت کے لیے کندھے سے اُوپر اُٹھتی ہوئی بندوق ٹہنیوں میں پھنس جاتی۔ مجھے رُکنا پڑتا تو اِس بیچ وہ چڑیا آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی۔ اب تک اُس چڑیا نے مجھے اِتنا موقع نہیں دیا تھا کہ اُس کی لطیف چہچہاہٹ اور اُس کے پنکھوں کی رنگین بناوٹ کو اپنے کیمرے میں نقش کر سکوں۔ وہ چڑیا اپنے روپ کی جھلک دِکھا کر نٹ کھٹ محبوبہ کی طرح آنکھوں سے یوں اوجھل ہو جاتی جیسے میرے ساتھ لُکا چھپی کا کھیل کھیل رہی ہو۔ پھر جیسے شرارت پر اُتارو بچہ کسی آڑ سے ''جھات'' کہہ کر ماں کو بتاتا ہے کہ وہ کہاں چھپا ہے، اِسی طرح چڑیا کی لطیف آواز کسی طرف سے آتی اور میں پیڑوں کی ٹہنیوں سے اُلجھتا اُس سمت چل پڑتا۔

ایسے میں اُس رنگین چڑیا کا پیچھا کرتے کرتے مجھے پتہ ہی نہ چلا کہ میں عام جنگل کی حد کو پار کر کے کب کسی قبیلے کے ذاتی جنگل میں داخل ہو گیا۔ اُس قبیلے کے کارندوں نے میرے کندھے پر لٹکی ہوئی بندوق کو دیکھ کر غالباً یہ سمجھا کہ میں وہاں اُن کے علاقے میں شکار کھیلنے آیا ہوں۔ بس اِسی جرم میں وہ مجھے اپنے گھیرے میں لیے پتہ نہیں کہاں لے جا رہے تھے۔

ہم کافی دیر تک چلتے رہے۔ چلتے چلتے میرے قدم ذرا سے دھیرے ہوتے تو اُن حبشیوں کے نیزوں کی تیکھی نوکیں میرے جسم کو چبھتی سی لگتیں۔ تبھی سامنے ایک بستی کا پھاٹک دیکھ کر میرا دِل بیٹھنے لگا۔ ایک ہی پل میں ڈر کے مارے میں پسینے میں نہا گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ پھاٹک کی لمبی چوڑی محراب اور دونوں ستون انسانی کھوپڑیوں سے سجے ہوئے ہیں۔ ہم جیسے ہی اِس گیٹ کے اندر داخل ہوئے ''تو ہا ہیا ہا ہیا'' کا شور مچاتے ہوئے نوجوان حبشیوں کی ایک ٹولی جن کے ہاتھوں میں تلواروں اور کلہاڑیوں سے ملتے جلتے ہتھیار پکڑے ہوئے تھے وہ ناچتے گاتے ہمارے آگے آگے ہو لیے۔

آخر یہ کارواں پیڑوں کے گھنے جھنڈ میں جا کر جہاں رُکا وہاں لکڑی کے ستونوں کے اُوپر کھلی سی چھت کے نیچے ایک بڑا تخت بچھا تھا۔ اِس تخت پر ٹیک لگانے کے لیے گاؤ تکیے

رکھے ہوئے تھے۔اس تخت کے سامنے دونوں طرف قبیلے کے بہت سے لوگ لکڑی کے گول گول سٹولوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔نوجوانوں کی ہاہیا ہاہیا کی آواز سنتے ہی اُن حبشیوں کی توجہ ہماری طرف گئی اور مجھے نیزوں میں گھرا ہوا دیکھ کر اُن کی باچھیں یوں کھل گئیں جیسے اُن کے لیے آج کی تفریح کا انتظام ہو گیا ہو۔

اس چھت سے ذرا ہٹ کر پہلے سے گڑھے ہوئے دو ستونوں کے اوپر ایک بڑا سا لٹھ رکھا تھا جس سے بندھی ہوئی لوہے کی زنجیریں لٹک رہی تھیں۔اِن کے نیچے الاؤ جلانے کے لیے لکڑیاں جمع کی جانے لگیں۔

یہ دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ مجھے اِن لوہے کی زنجیروں سے لٹکا کر نیچے الاؤ کی آگ جلا دی جائے گی۔ یہ سوچ کر میں زمین پر گرتے گرتے بچا۔

مجھے اپنے بچنے کی کوئی اُمید نہیں تھی، اور اگر تھی تو صرف اتنی کہ ابھی سامنے اونچے تخت والی مسند پر کوئی نہیں بیٹھا تھا۔ اِس کا مطلب میں نے یہی لگایا کہ ابھی اِس قبیلے کا سردار یہاں موجود نہیں ہے۔

ایک طرف تو الاؤ کے نیچے موٹی موٹی لکڑیاں اِس طرح کھڑی کی جانے لگیں کہ جب الاؤ جلے تو اُس کے شعلے اوپر لٹکنے والے آدمی کو اپنی لپیٹ میں لے سکیں۔ دوسری طرف میں نے دیکھا کہ ایک حبشی کو کچھ کہا گیا اور وہ بھاگتا ہوا ایک طرف کو نکل گیا۔

میرا اندازہ ٹھیک نکلا۔ جس طرف وہ حبشی گیا تھا، تھوڑی دیر بعد اُدھر سے کچھ پالکی بردار ایک خوبصورت سی پالکی اُٹھائے نمودار ہوئے اور جیسے ہی وہ پالکی اِس لکڑی کی چھت کے بیچ و بیچ لا کر رکھی گئی اُس میں سے ایک لحیم شحیم حبشی باہر نکلا۔ وہ یقیناً اُن کا سردار تھا۔ اُس نے اپنے سر پر پھولوں کا بنا ہوا ایک تاج پہن رکھا تھا اور اُس کی کمر میں ایک رنگین ٹپکا سا بندھا ہوا تھا جس کا ایک سرا اُس کے کندھے پر لٹکا ہوا تھا۔ قبیلے کے سردار نے آتے ہی ایک سرسری نظر سے میری طرف دیکھا اور جیسے ہی وہ اپنے تخت پر جا کر بیٹھا اُس کے درباری میری طرف اشارہ کرتے ہوئے اُسے کچھ بتانے لگے۔ میرا خیال ہے کہ انہوں نے اُسے میرے جرم کی

تفصیل بتائی ہوگی۔ یا پھر یہ کہ مجھے سزا دینے کے لیے سارے انتظام مکمل کر لیے گئے ہیں۔ یہ اندازہ میں نے اس طرح لگایا کہ درباریوں میں سے کوئی ستونوں سے بندھی ہوئی زنجیروں اور اُس کے نیچے جلنے والے الاؤ کی طرف ہی اشارہ کر رہا تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں میری قسمت کا فیصلہ ہونے کے لیے مقدمے کی کاروائی شروع ہوئی۔ وہ نیزہ بردار جو مجھے پکڑ کر لائے تھے انہوں نے اونچی آواز میں کچھ کہنا شروع کیا۔ وہ اپنی اپنی بات کہہ چکے تو سردار نے اشارے سے مجھے اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔

میں نیزہ برداروں کے گھیرے میں گھرا سردار سے کوئی دس فٹ کے فاصلے پر جا کر کھڑا ہو گیا۔

'کس دیس کے باسی؟' سردار نے مجھ سے انگریزی میں پوچھا۔

اُسے انگریزی بولتے ہوئے دیکھ کر میری جان میں کچھ جان آئی کہ اب کم از کم کوئی میری بات سُننے والا تو ہے۔ لیکن پھر بھی ڈر کے مارے میری آواز جیسے گلے میں ہی اٹک کر رہ گئی۔

سردار نے اپنا سوال دُہرایا۔

''انڈیا'' بڑی مشکل سے میں یہ لفظ ادا کر پایا۔

''ہندوستان''؟

سردار کو انڈیا کے لیے ہندوستان کا لفظ استعمال کرتے دیکھ کر مجھے حیرانی بھی ہوئی اور خوشی بھی۔ میں نے دیکھا کہ اُس کی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہوئی اور اُس نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

''ہندوستان'' اب کی میں نے کچھ اونچی آواز میں حوصلے سے کہا۔

گون دی، گون دی دیش! یہ کہتے ہوتے اُس نے تالی بجائی۔

تالی کے بجتے ہی نیزہ بردار سپاہی پیچھے ہٹ گئے اور سردار نے مجھے اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا۔

''میں ایک قدم آگے بڑھ کر رُک گیا۔

اُس نے مجھے پھر آگے آنے کو کہا۔

میں ایک قدم اور آگے بڑھ کر رُک گیا۔

اب کی سردار نے اپنے تخت پر ہاتھ مارا۔ جس کا مطلب تھا کہ میں اُس کے تخت پر اُس کے پاس جا کر بیٹھوں۔

میں ڈرتا ڈرتا وہاں جا کر بیٹھ گیا۔

اب سردار کے چہرے پر مسرت کے آثار تھے۔ اُس نے گون دی گون دی کہتے ہوئے اپنے لوگوں کو پتہ نہیں کیا کیا بتایا۔

اور پھر سارا ماحول بدل گیا۔

اُسی وقت کھانے پینے کی چیزوں سے بھری ہوئی کتنی طشتریاں لا کر رکھی گئیں۔ ابھی میں سردار کے ساتھ مل کر میٹھے پھل کھا ہی رہا تھا کہ میرا دوست بیمار ہوتے ہوئے بھی میری تلاش میں وہاں پہنچ گیا۔

تھوڑی دیر بعد جب ہم دونوں قبیلے کے سردار کی پالکی میں بیٹھ کر واپس اپنے ریسٹ ہاؤس کی طرف آ رہے تھے تو میرے دوست نے مجھے بتایا۔ ''آج تو تم مہاتما گاندھی کے دیش کے باشندے ہونے کی وجہ سے بچ گئے ورنہ بڑا غضب ہو جاتا۔ یہ سردار گاندھی کا بڑا بھگت ہے۔ اپنی جوانی کے دنوں میں یہ ہندوستان میں گاندھی جی کے آشرم میں کچھ دن رہ چکا ہے۔

تبھی میرے کانوں میں اُس کے الفاظ گون دی گون دی گونج گئے۔

وہ سانحہ تو ٹل گیا۔ لیکن بہت دیر تک مجھے یقین ہی نہیں آیا کہ اس پردیس میں محض مہاتما گاندھی کے دیش کا باشندہ ہونے کی وجہ سے میری جان بچ گئی۔

اور جب مجھے یقین ہو گیا کہ میں زندہ ہوں تو مجھے احساس ہوا کہ کسی دن اُس مفکر کی کہی ہوئی بات بھی غلط ثابت ہو گی جس نے کہا تھا کہ کچھ عرصے بعد لوگوں کو یہ یقین ہی نہیں آئے گا کہ موہن داس کرم چند نام کا کوئی شخص کبھی اس دھرتی پر آیا تھا۔

میرا خیال ہے کہ دُنیا کو یقین کرنا پڑے گا۔

○○○

امانت کی چابیاں

مولوی برکت علی کی بات بتاؤں۔ لیکن اتنی عقل کہاں سے لاؤں کہ اُس کی انسانیت لفظوں میں بیاں ہو سکے اور اُس کی شرافت آپ پر عیاں ہو سکے۔

وہ میرے چچا تھے۔ خون کے رشتے سے نہیں، بلکہ گاؤں کے رشتے سے۔ وقت کے اُس دور میں گاؤں کا رشتہ، خون کے رشتے کی طرح ہی اہمیت کا حامل تھا۔

آپ پوچھیں گے کیسے؟

میں بتاتا ہوں۔

پنجاب میں گاؤں کو پنڈ کہتے ہیں۔ پنڈ سنسکرت کا لفظ ہے، جس کا مطلب ہوتا ہے۔ شریر، جسم، یعنی ایک پنڈ ایک جسم ہوتا ہے اور اُس میں رہنے والے تمام لوگ اُس جسم کے مختلف انگ ہوتے ہیں۔ آنکھیں ناک، کان اور جسم کے دوسرے بھی حصّے۔ اور سب کی ایک سی اہمیت ہوتی ہے۔ اسی لیے جب کبھی کسی بڑی حویلی اور طبیلے میں پھول کھلتا تھا تو اُس کی خوشبو تمام دیواروں کو پھاند کر کچے گھروں میں پہنچ جاتی تھی۔ جب کسی کچے گھر کی دیوار گرتی تھی تو بڑی حویلیوں کے اندر بھی اُس کے دھمک سنائی دے جاتی تھی۔ یوں کہہ لیجئے کہ جس طرح تمام انگ مل کر ایک جسم کی تشکیل کرتے ہیں۔ اسی طرح تمام افراد کے میل سے ایک پنڈ وجود میں آتا ہے۔

اسی لیے میں نے کہا کہ مولوی برکت علی میرے چچا تھے۔ میرے والد کے چھوٹے بھائی چچا مہر سنگھ جیسے چچا۔ گول چہرہ، مولویوں کی سی ترشی ہوئی داڑھی کی وجہ سے کچھ لمبوترا سا لگتا تھا۔ رنگت پکی ہوئی گندم کی بالیوں سی سنہری، لباس قمیض پاجامہ، دل کی

پاکیزگی کی طرح دُھلا دُھلایا۔ آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی تھی اور ماتھے پرنور کا حالہ سا بنا کر چمکتی تھی۔ بہت کم بولتے تھے مگر الفاظ میں موذن کی سی مٹھاس تھی۔ گاؤں کے فقیروں کے خاندان سے تعلق تھا مگر تونگروں کے تونگر تھے۔ صبر صبوری کا مزاج گھٹی میں ملا تھا۔ اس لیے جو خوشیاں ان کے کچی دیواروں والے گھر میں ڈیرا ڈالے رہتی تھیں وہ گاؤں کے سینکڑوں بیگھے زمینوں کے کلّے ذیٔ پٹھانوں اور لاکھوں کا بیوپار کرنے والے بیوپاریوں کو بھی میسّر نہیں تھیں۔

چچا دسویں پاس تھے۔ اُس وقت کے دیہی علاقے کے تعلیمی معیار کے مطابق اعلیٰ تعلیم یافتہ۔ قرآن شریف پورا نہیں تو آدھا حفظ تھا۔ شیخ سعدی اور مولانا رومی کی حکایتوں کے اس حد تک قائل کہ اُن کے کرداروں کی زندگی کے مطابق خود کو سچائی، نیکی، ایمانداری اور پارسائی کے ڈھانچوں میں ڈھالنے کی کوشش میں لگے رہتے۔ یوں بھی وہ جہاندیدہ آدمی تھے۔ دوسری عالمی جنگ میں پتہ نہیں کن بیرون ملکوں کی خاک چھان آئے تھے۔ اُن کے علم اور زہد کا حاصل صرف اتنا تھا کہ گاؤں والے انہیں عالم فاضل سمجھتے تھے اور دور دراز گئے اپنے عزیزوں اور دوست احباب کی چٹھیوں کو اُنہی سے لکھوانا پڑھوانا پسند کرتے تھے۔

برکت علی سے خط لکھواؤ۔ جواب جلدی آئے گا۔

برکت علی سے خط پڑھواؤ۔ خوشی کی خبر وہی سناتا ہے۔

ایسا اعتقاد تھا لوگوں کو مولوی برکت علی کی ذات میں، یہ اعتقاد ہی مولوی برکت علی کی سب سے بڑی دولت تھی۔

پھر ایک دن اُن کی اِس ساکھ پر راکھ پڑ گئی۔

بات یہ ہوئی کہ اُن کے سب سے بڑے بزرگ سائیں جھنڈے شاہ اپنے سچے سائیں سے جا ملے۔ اُن کے بعد خاندان کی ایک ایسی روایت کا بوجھ مولوی برکت علی پر آپڑا جسے اُٹھانے کے لیے وہ قطعی تیار نہیں تھے۔ میں نے آپ کو پہلے بتایا نہ کہ اُن کا تعلق فقیروں کے خاندان سے تھا۔ تین چار نسلوں سے وہ اِس پیشے کو چھوڑ چکے تھے اور تھوڑی

سی زمین پر کھیتی باڑی کر کے اپنا گزارا کرتے تھے۔ ہاں گداگری کی کوئی نشانی باقی رہ گئی تھی تو صرف یہ کہ اُن کے جو بزرگ اس گاؤں میں آ کر بسے تھے اُن کی برسی کے موقع پر مزار پر چادر چڑھائی جاتی تھی۔ نیاز کی دیگ پکتی تھی۔ اس خرچے کو پورا کرنے کے لیے برسی کے مہینے کے پہلے چاند کے روز سائیں جھنڈے شاہ اپنے بزرگوں کا ٹاکیوں والا چوگا پہن کر اور ہاتھ میں کاسہ لے کر پھیری کے لیے نکلتے تھے۔ سائیں جھنڈے شاہ تو کاسے میں رکھے دھیلوں اور پیسوں کو چھنکاتے، الکھ جگاتے گاؤں کا چکر مار آتے۔ یہ رسم بھی غالباً اس لیے نبھائی جاتی تھی تا کہ نئی نسلوں کو اُن کی اوقات یاد رہے۔ ویسے گاؤں کے لوگ تو دڑوپے بھر بھر کر اچھے سے اچھے چاول سائیں جھنڈے شاہ کے ڈیرے پر پہنچا دیا کرتے تھے۔

جیسے ہی یہ رسم پوری ہوتی، فقیروں کے چوگے کو سال بھر کے لیے دوبارہ مزار کی کوٹھری میں ٹانگ دیا جاتا۔ وہیں کہیں آلے میں گداگری کا کاسہ یوں اُلٹا پڑا رہتا جیسے وہ بڑے پیر کے مزار پر سجدے میں گرا اُس کے ہاں عرض گزار رہا ہو کہ اے بڑے پیر دست گیر خدا کے بندے پر ایسی بدبختی کبھی نہ آئے کہ اُسے کاسہ ہاتھ میں لے کر بھیک مانگنی پڑے۔

اب جھنڈے شاہ کی وفات کے بعد یہی بدبختی، چاہے رسماً ہی سہی، برکت علی پر آ رہی تھی اور وہ اسے نبھانے کے لیے کسی طور تیار نہیں تھے۔

''برکت علی بڑے پیر کے مزار کی نیاز کے لیے اپنا گھر بیچ دے گا لیکن گداگری کا چوگا ہرگز نہیں پہنے گا'' اُن کے سِلے ہوئے لبوں کی خاموشی بول بول کر یہی کہتی تھی۔

سب نے لاکھ سمجھایا۔ مگر برکت علی قطعی نہیں مانے اور آخر ہوا یہ کہ گاؤں والوں کے دیے ہوئے چاولوں کی دیگ الگ پکی اور برکت علی کی دیگ الگ۔

مولوی برکت علی کے خاندان کے لوگ تو اِس لیے ناراض تھے کہ بڑے پیر رسم توڑنے کے لیے ناراض ہو کر خاندان کے لیے کوئی مصیبت نہ کھڑی کر دیں۔ اُن پر کوئی بُری گھڑی نہ آ جائے۔ مولوی برکت علی کا کہنا تھا کہ بڑے پیر نے ہی گداگری کا پیشہ چھوڑنے کی ہمت کی تھی۔ اس رسم کے پوری طرح ختم ہونے سے اُن کی روح کو خوشی

حاصل ہوگی۔ سکون ملے گا۔

مگر اُن کی بات کو کون سنتا تھا۔ گاؤں والے بھی دو حصّوں میں بٹے ہوئے تھے۔ کچھ اسے ٹھیک سمجھتے تھے تو دوسرے یہ بھی کہتے تھے کہ فوج میں حولدار ہونے کا ایسا بھی کیا غرور۔

اِس ماحول میں سیدھے سادے برکت علی بڑی گھٹن محسوس کر رہے تھے۔ آخر اُنہیں اس سے فرار کا راستہ مل گیا۔ اندھیرے میں روشنی کی کرِن اُبھری۔ سولجر بورڈ کی طرف سے اُنہیں اِطلاع ملی کہ ریلوے میں کلرکوں کی آسامیاں ہیں، وہ چاہیں تو اُس کے لیے درخواست دے سکتے ہیں۔

یہیں سے چچا برکت علی میری زندگی کا حصّہ بن گئے۔ یہ بات ہے 1945ء کی۔ اُسی سال میں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا اور کالج میں داخلہ نہ لے کر بیمار والد کی تیمارداری کر رہا تھا۔ ایک دن اُنہوں نے مجھے گھیرا۔ میں بھی کلرک کی آسامی کے لیے درخواست دے دوں۔

لیکن چچا میں تو.....

مجھے معلوم ہے۔ تجھے پڑھنا ہے..... لیکن درخواست دینے میں کیا حرج ہے۔ انٹرویو کے لیے بلا لیے گئے تو لاہور گھومنے کا موقع ملے گا۔ میرے نہ نہ کرتے اُنہوں نے فارم منگوایا۔ خود ہی نارووال جا کر سرٹیفکیٹ ٹائپ کروائے اور اپنی درخواست کے ساتھ میری درخواست کیا نتھی کی کہ کلرکی میرے وجود کے ساتھ چپکا دی۔ میں ان کے ساتھ لاہور دیکھنے گیا۔ مقابلے کے اِمتحان میں پاس ہو گیا۔ نہایت بے دلی سے انٹرویو دی مگر پھر بھی مولوی برکت علی کے ساتھ ساتھ میں بھی چن لیا گیا اور آخر 31-8-46 کو اُن کے ساتھ ایک ہی دفتر میں ملازمت شروع کر دی۔

میری یہ ملازمت بھی ایک طرح سے رسم نبھانے جیسی تھی۔ ملک کی تقسیم سے پہلے سال بھر کے عرصے میں زیادہ سے زیادہ تین چار مہینے ہی دفتر گیا۔ باقی کا عرصہ تو والد کی بیماری کے باعث بغیر تنخواہ کی چھٹی لے کر گھر پر پڑا رہا۔

مولوی برکت علی کی دلوائی ہوئی یہ نوکری جو میں نے نہایت بے دلی سے شروع کی تھی

ملک کی تقسیم کے بعد پورے خاندان کی گزراوقات کا واحد سہارا بن گئی تو ایسا لگتا تھا جیسے مولوی برکت علی ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو قبر سے اُٹھ کر مجھے ڈیڑھ سو روپے دینے آتے تھے کہ یہ رکھ لو۔ پردیس میں کام آئیں گے۔

ایک بار بچپن میں بھی مولوی برکت علی کی شفقت کا لمس مجھے سائیں جھنڈے شاہ کے پھنکاروں کی آگ سے بچا چکا تھا۔ تب میں چوتھے پانچویں درجے میں پڑھتا تھا۔ اُس روز میں اپنے بڑے کنوئیں سے کھٹے میٹھے بیروں سے اپنی جیبیں بھر کر لایا تھا۔ جب میں مزار کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ مولوی برکت علی کا بیٹا منور مزار کی چار دیواری کے اندر گرے کیکر کے پھولوں کو مور پنکھوں کے جھاڑن سے صاف کر رہا تھا۔ منور سے میری دوستی تھی۔ وہ نیاز بٹنے کے موقع پر میری جھولی میں میٹھے چاولوں کے ایک کے بجائے دو دو کٹورے ڈال دیا کرتا تھا۔ اُس وقت میں نے بیروں سے بھری جیبوں کی طرف اشارہ کیا تو اُس نے کہا کہ مزار کی چار دیواری کے اندر آ جاؤ۔''

میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور پی ٹی والے ربر کے سول والے خاکی بوٹ پہنے ہی کھڑکی نما دروازے کو پھاند کر اندر چلا گیا۔ میری بدقسمتی کہ سائیں جھنڈے شاہ کی مجھ پر نظر پڑ گئی اور وہ پھنکارتا ہوا میری مرمت کرنے ہی والا تھا کہ غیب سے مولوی برکت علی وہاں پہنچ گئے۔ اُنہوں نے نہ صرف جھنڈے شاہ کے غیض وغضب سے مجھے بچایا بلکہ دُعائیں پڑھتے ہوئے کتنی بار مجھ پر پھونکتے رہے۔ پھر مجھ سے بڑے پیر کے مزار پر سجدہ کروایا تاکہ وہ جوتے پہن کر اندر جانے کے لیے مجھے معاف کر دیں۔

تقسیم کے بعد فسادات پھوٹ پڑے۔ میرے والد کسی بھی طرح اپنا آبائی گاؤں اور گھر چھوڑنے پر تیار نہیں تھے۔ اردگرد کے دیہاتوں میں فساد کی آگ بھڑک اُٹھی۔ دباؤ بڑھا تو اچانک ایک دن دادی نے گھر کی چابیاں برکت علی کی ماں کو پکڑائیں اور ہم نکل پڑے۔ صرف یہ سوچ کر کہ امن بحال ہوگا تو واپس آ جائیں گے لیکن یہ نہ ہو سکا۔

چند سال پہلے جب مجھے پاکستان میں اپنے گاؤں جانے کا موقع ملا تو پتہ چلا کہ ہمارا آدھا گاؤں دریابُرد ہو چکا ہے۔ راوی میں باڑھ آئی تھی اور وہ اپنے ساتھ بہا لے گئی کھیت،

بازار، اسکول، جامع مسجد جھنڈے شاہ کا ڈیرا جھنڈے شاہ کی مسجد، بڑے پیر کا مزار، چچا برکت علی کی قبر، محلے کے محلے، میرا گھر، حویلی، بیٹھک، بڑے اور چھوٹے کنوئیں، برگد کا پیڑ، کھیتوں کے بیچ سے جاتی پگنڈنڈیاں جن کے ساتھ میرے بچپن کی یادیں جڑی تھیں۔ یہ سب کے سب یوں گم ہو گئے جیسے اُن کا کبھی کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ جہاں یہ سب کچھ تھا وہاں دریا کا پاٹ چوڑا ہوتا چلا گیا تھا اور جیتے جاگتے سانس لیتے وقت کے 'روشن لمحے' ماضی کے اندھیروں میں ریت بن کر چار سو بکھرے پڑے تھے۔

جہاں مجھے افسوس تھا کہ میں اپنے گھر کے پسار میں اُس اندھیرے کونے کو نہیں دیکھ سکا جہاں میری زندگی کی چنگاری روشن ہوئی تھی وہاں اس بات کا بھی افسوس تھا کہ چچا برکت علی کی قبر پر حاضری بھرنے سے بھی محروم رہ گیا ہوں۔ ابھی میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ میرے تصور کی آنکھوں کے سامنے چچا برکت علی کا نورانی چہرہ چمکا۔ تبھی مولوی برکت علی کا چودہ پندرہ سال کا پوتا اپنے مرحوم دادا کے تمام نین نقش لیے میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے اپنی جیب سے ہمارے گھر کی چابیوں کا وہ گچھا نکالا جو میری دادی نے پاکستان سے آتے وقت گھر کی دیکھ ریکھ کے لیے مولوی برکت علی کی ماں کے حوالے کی تھیں۔ گھر جس کا اب کوئی وجود نہیں رہ گیا تھا۔

چابیاں ہاتھ میں لے کر میں نے دور اُس جگہ کی طرف دیکھا جہاں کہیں ہمارا گھر ہوا کرتا تھا۔ اپنے گھر کو وہاں ہوا میں معلق دیکھ کر میں نے زنگ آلود چابی، زنگ آلود تالے میں ڈالی اور اُسے کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔

لیکن المناک حقیقتوں کے تالے چابیوں کو ہوا میں گھمانے سے نہیں کھلتے۔

وہ تالہ تو نہیں کھلنا تھا۔ نہ کھلا۔ میری آنکھوں سے آنسو ٹپکے اور چچا برکت علی کے پوتے کی ہتھیلی پر بکھر گئے تو مجھے لگا جیسے میرا سر برکت علی کے پوتے کے سامنے نہیں بلکہ چچا برکت علی کے سامنے تعظیم سے جھکا جا رہا تھا۔

درحقیقت ایسا ہی ہوا تھا۔ انسانی اقدار کی پہچان، نیکی، ایمانداری، شرافت، پارسائی کے ایسے اوصاف جب ایک نسل سے نئی نسل میں منتقل ہو جاتے ہیں تو زندگی بابرکت بن

جاتی ہے اور مولوی برکت علی جیسے لوگ ناقابلِ فراموش ہو جاتے ہیں۔

کسی صاحب ایمان کے لیے نہیں۔

آنے والی تمام نسلوں کے لیے۔

بنی نوعِ انسان کے لیے۔

اسی لیے میں وہ چابیاں اپنے ساتھ لے آیا تھا تاکہ انہیں اپنی اولاد کو سونپ سکوں۔ مجھے یقین ہے کہ زندگی میں جب کبھی کوئی ایسا مسئلہ درپیش ہو جس کا کوئی حل نہ نکل پا رہا ہو تو اسے ان چابیوں سے ہی کھولا جا سکتا ہے جنہیں مولوی برکت علی نے امانت کے طور پر اپنے پاس محفوظ رکھا اور اپنی نئی نسل کے ذریعے مجھ تک پہنچا دیا۔

○○○

سب سے اچھا دوست

آٹھ نو سال کی عمر میں ندی کی طرف سے لوٹتے ہوئے راستے پر لگے پیڑوں، گلی کے درودیوار، اڑوسیوں پڑوسیوں اور گھر کے افراد، غرضیکہ ساری دُنیا سے نظریں چراتے ہوئے سیدھا اپنے کمرے میں پہنچ کر، میں اپنے پلنگ کی سلوٹیں نکال رہا ہوں۔

یہ بات ستر بہتر سال پرانی ہے۔ مگر جس طرح پیڑ سے سوکھ کر ٹوٹے ہوئے پتوں کو ہوا اُڑا کر جہاں تہاں لیے پھرتی ہے اسی طرح وقت کے پیڑ سے ٹوٹ کر گرے ہوئے یہ لمحے اکثر عمر کے لمبے فاصلوں کو پاٹ کر میرے سامنے اُس منظر کو تازہ کر دیتے ہیں اور میرے ہاتھ خود بخود حالات کی چادر پر پڑی سلوٹوں کو سیدھا کرنے کی کوشش میں لگ جاتے ہیں۔

تب میں چوتھی جماعت میں پڑھتا تھا۔ اُس دن میں نے حساب کے ماسٹر کا دیا ہوا گھر کا کام نہیں کیا تھا۔ ایسے موقعوں پر حساب کا ماسٹر جب اُنگلیوں پر زور سے موٹا رُول مارتا تھا تو سارے بدن میں درد کی رو دوڑ جاتی تھی۔ اُنگلیوں پر نیلے نشان پڑ جاتے تھے۔ سردی کے موسم میں تو دو دو دن اُنگلیوں سے قلم پکڑنا دشوار ہو جاتا تھا۔

اسی سزا سے بچنے کے لیے میں اسکول سے بھاگ کر ندی کنارے چلا گیا تھا اور وہاں سے لوٹ کر پلنگ پر بچھی چادر کی سلوٹیں نکال رہا ہوں۔

میں سلوٹیں نکال رہا ہوں۔ چادر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مجھے بڑا اچھا لگ رہا ہے۔ جیسے جیسے سلوٹیں نکل رہی ہیں مجھے لگ رہا ہے جیسے میری کاپیوں پر بڑے بڑے دائروں میں گھر کے منظر کے ہندسے، اور میری غلطیاں بتانے والی ایک دوسری کو کاٹتی لال لال لکیریں مٹ رہی ہیں۔

لکیریں مٹ رہی ہیں...اور میں سہ ماہی امتحان میں پاس ہو گیا ہوں۔ تصور ہی تصور میں فیل ہونے والے امتحان میں پاس ہونے کے بعد، اپنے پلنگ کے چاروں طرف گھوم گھوم کر، چادر کے کونوں کو کھینچ کھانچ کر بل نکالنے شروع کیے تو تصور کے گھوڑے پر سوار، اسکول کی وردی پہن لی اور ہاکی کے میدان میں چاروں طرف دوڑنے لگا۔ میرے پاس گیند آیا۔ میں گیند لے کر چلا، گیند میری ہاکی سے چپکی، خود ہی ڈی کی طرف بڑھ رہی ہے۔ مخالف ٹیم کے ایک کھلاڑی کو جھانسہ دیا، دوسرے کو کاٹا، تیسرے کو پار کر کے ڈی میں پہنچ گیا۔ گولی نے گیند روکنے کے لیے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔ میں نے ہٹ ماری اور کھٹاک کے ساتھ گول ہوتے ہی سارا میدان تالیوں کی گڑگڑاہٹ سے گونج اُٹھا۔ اپنی ٹیم کے کندھوں پر سوار میں میدان کے چاروں طرف دیکھتا ہوں۔

میری نظریں باپو کو ڈھونڈ رہی ہیں۔

اپنے باپ کو کہیں نہ پا کر میں اپنی خیالی دُنیا سے واپس اپنے کمرے میں لوٹ کر سلوٹیں نکالنے لگا۔

یہ سلوٹیں نکالنے کا خیال مجھے اپنے دوست کموکوندی کے کنارے سوکھے کپڑے تہہ کرتے دیکھ کر آیا تھا۔ کمو دھوبیوں کا لڑکا ہے۔ میرا ہم عمر۔ میرا پکا دوست۔ اُس دِن سکول سے بھاگ کر ندی کے کنارے میں اُسی کے پاس گیا تھا۔ وہ سکول نہیں جاتا۔ مجھے پتہ ہے کہ وہ دن بھر ندی کے کنارے اپنے ماں باپ کی کپڑے دھونے میں مدد کرتا رہتا ہے۔

'مجھے دیکھ کر وہ بڑا خوش ہوا۔ اُس نے جلدی جلدی اپنے ہاتھ کا کام نپٹایا۔ بڑا سا دیگچہ جس میں پانی گرم ہو رہا تھا۔ اُس میں میلے کپڑے ڈال کر ذرا سی کھار ڈال دی کہنے لگا۔ یہ کھار دیکھنے میں مٹی ہے، لیکن اس میں سوڈا بھی ہوتا ہے۔ یہی سوڈا میل کو کاٹتا ہے۔ اُس کے بعد اُس نے پتھر کے چولہے میں تھوڑی سی سوکھی ٹہنیاں ڈال دیں تا کہ دیگچے کے نیچے جل رہی آگ دھیمی نہ ہو جائے۔

پھر ہم کھیلنے لگے۔ ہم نے ریت کے کتنے ہی گھروندے بنائے۔ گھروندے بناتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ اُس کا گھروندا میرے گھروندے سے زیادہ خوبصورت اور

پائیدار بن رہا ہے۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ ایسا کیوں ہے، تو وہ کہنے لگا۔ میں دن بھر اور کرتا کیا ہوں۔ گھروندے ہی تو بناتا رہتا ہوں۔ مشق سے سب آجاتا ہے۔

گھروندے بنانے سے جی بھر گیا تو ہم ندی میں تیرنے لگے۔ مجھے لگا کہ تیرنے میں بھی وہ مجھ سے تیز ہے۔ وہ تو مچھلی کی طرح تیرتا ہوا گہرے پانیوں میں وہاں تک چلا گیا تھا۔ جہاں جانے کے لیے میں اپنے اندر ہمت نہیں بٹور پایا تھا۔

ہم ندی سے باہر نکل کر کپڑے پہن ہی رہے تھے کہ اُس کی ماں نے آواز دی۔

''کمو۔ سوکھے کپڑوں کے ڈھیر کو تہہ کر کے رکھ دو تو گٹھڑ باندھنے میں آسانی ہوگی۔''

میرے دیکھتے ہی دیکھتے اُس نے ایک چادر ریت پر بچھائی اور سوکھے کپڑوں کو تہہ کر کے اُس پر رکھنا شروع کیا۔ اُس نے ایک ڈھیری کو تہہ کیا۔ پھر دوسری کو، پھر تیسری کو، یہ ہو چکا تو اُس کے باپ اور ماں نے دو گٹھڑ باندھ کر گدھے پر لاد دیے۔

گدھے کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے میں نے کمو کے چہرے کی طرف دیکھا، تو مجھے لگا کہ میں اسکول میں تو پھسڈی ہوں ہی، اِس ان پڑھ کمو سے بھی زیادہ گیا گزرا ہوں اُس نے مجھ سے بہتر گھروندے بنائے، یہ مجھ سے بہتر تیر سکتا ہے اور کپڑے تو میں اِس کی طرح تہہ کر ہی نہیں سکتا۔

میں نے دور دور تک نظر دوڑائی۔ دریا کے پاٹ میں ریت کی تہیں اس طرح ہموار تھیں کہ مجھے لگتا تھا کہ دریا کے کنارے چلتی ہوا نے نہیں بلکہ کمو نے ہاتھ پھیر پھیر کر انہیں قرینے سے بچھایا ہو۔

گھر پہنچ کر اُس نے میری مدد سے کپڑے کے گٹھڑ گدھے کی پیٹھ سے اُتارے اور اُسے پھر باہر کی طرف ہانک دیا۔

''اب یہ خود بخود گھاٹ پر پہنچ جائے گا۔'' کمو نے کہا

گدھے کو خود بخود گھاٹ کی طرف جاتے دیکھ کر مجھے ایسا لگا کہ جیسے مجھے بھی وہ راستہ مل گیا ہے جس پر چل کر مجھے اپنے گھاٹ پر جانا ہے۔

اُس روز گھر لوٹ کر میں نے اپنے پلنگ پر بچھی چادر کی سلوٹیں نکالنی شروع کیں تو

مجھے پتہ ہی نہ چلا کہ کب میری کتابیں قرینے سے لگ گئیں۔ کب قلم، دوات، کاپیاں میری تمام چیزیں اپنی اپنی جگہ پر پہنچ گئیں۔

'مجھے پتہ ہی نہ چلا کہ کب تین مہینے بیت گئے اور میں ششماہی امتحان میں اچھے نمبروں سے پاس ہوگیا۔

وہ دِن اور آج کا دِن
لمبی زندگی کا لمبا سفر

دریا کے پاٹ میں دُور دُور تک پھیلی ہوئی ریت کی تہیں، ایسا لگتا ہے جیسے ہوا نے نہیں، میں نے ہی اُن سب کو لہروں کے سانچے میں ڈھال کر قرینے سے بچھایا ہے۔ اور ساتھ ہی سنور گئی ہے زندگی۔

اب جب بھی کوئی مجھ سے پوچھتا ہے کہ تمہارا سب سے اچھا دوست کون ہے تو میرا جواب ہوتا ہے۔

''دھوبیوں کا لڑکا۔ ان پڑھ کمو۔ کمو جو بچپن کے دِن بیت جانے کے بعد دوبارہ کبھی نہیں ملا۔ مگر پھر بھی دوستی نبھا رہا ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ مددگار ہے اُس کا سدھا ہوا گدھا۔

زندگی کے میلے کپڑے گھاٹ تک لے جانے اور وہاں سے اُجلے کپڑے دھو کر لانے کے لیے وہ انجانے ہی میرے ساتھ ساتھ چلتا رہتا ہے۔

○○○

بہانہ

پہلے ہی دِن جب میں نے اپنی نئی کار باہر نکالی تو ایک خوبصورت عورت دروازہ کھول کر میرے مقابل آ کر بیٹھ گئی، اور کہنے لگی۔

''گاڑی تو بہت خوبصورت ہے''

''آپ سے زیادہ نہیں۔'' میں نے اُس کے حُسن کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔

''آپ مجھے بھی گاڑی چلانا سکھادیں گے؟'' اُس نے اپنی خوبصورت آنکھوں کو شرارت سے نچاتے ہوئے کہا۔

''آپ جیسی خوبصورت عورت کو کون انکار کرسکتا ہے؟ کل سے ہی شروع کردیں گے۔''

''آج سے کیوں نہیں؟'' اُس عورت نے بڑے محبوبانہ انداز میں کہا۔

اور میں انکار نہ کرسکا۔ اُسی وقت اُسے ساتھ لے کر سونی سڑک کی طرف گاڑی موڑ دی۔

یہ سلسلہ پندرہ بیس دِن متواتر چلتا رہا۔ اُس دوران میں اُس عورت کو ویل پر قابو پانے، بریک لگانے گیر بدلنے جیسے گاڑی چلانے کے ضروری گُر سکھاتا رہا۔ ایسا کرتے ہوئے اور بھی بہت کچھ ہوا۔ مجھے اُس عورت کے قریب سٹ کر بیٹھنے کے موقع ملے۔ کبھی اُس کے ہاتھ سے ہاتھ چھو جاتا۔ کبھی کلائی سے کلائی تو کبھی ٹانگ سے ٹانگ۔ اور یہ سب کچھ مجھے اتنا اچھا لگتا تھا کہ کبھی کبھی تو میں جان بوجھ کر اُس کی کلائی پکڑ لیتا تھا۔ کبھی کبھی وہ بھی جان بوجھ کر میرے پاؤں کے اُوپر اپنا پاؤں رکھ دیتی تھی اور پھر بڑے معنی خیز انداز

سے میری طرف دیکھتی تھی۔

یہ سارے مرحلے ہم نے پہلے آٹھ دس دِن میں ہی طے کر لیے تھے۔ اب اُسے گاڑی چلانا بھی کافی حد تک آ گیا تھا۔ اب اُسے میری مدد کی ضرورت نہیں تھی۔ اب وہ اکیلے بھی گاڑی چلا سکتی تھی۔ لیکن ایسا لگتا تھا کہ گاڑی سیکھنا سکھانا تو محض ایک بہانہ تھا۔ ہمارے اندر ایک دوسرے سے ملنے ایک دوسرے کے ساتھ سٹ کر بیٹھنے، ایک دوسرے کے ہاتھ کو چھونے کی خواہش زیادہ اہم ہوگئی تھی۔ اس لیے اب تو ہم ایسا بھی کرنے لگے تھے کہ وقت بے وقت لمبی ڈرائیور پر نکل جاتے۔ بہانہ یہ تھا کہ گاڑی چلانے کی جتنی زیادہ مشق ہو جائے اُس قدر زیادہ اپنے آپ پر بھروسہ پیدا ہو جاتا ہے۔

پھر ایک دن گیر کچھ زیادہ ہی پھنس گیا۔

اُس نے گیر کی مٹھی پر ہاتھ رکھے میری طرف پیار بھری نظر سے دیکھا۔ میں نے اُس کے ہاتھ کے اُوپر ہاتھ رکھ دیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ کچھ اِس ادا سے میری طرف جھکی کہ اُس کا سر میری چھاتی پر آ کر رُک گیا، اور اُس کے بالوں کی خوشبو سے مجھ پر ایک نشہ سا طاری ہو گیا۔

''گیر پھنس گیا ہے۔'' اُس نے ایک ادا سے یہ جملہ ادا کیا۔

''نہیں۔ میں تمہارے پیار کے جال میں پھنس گیا ہوں۔''

''میں بھی'' اُس نے ایک ادا سے میری طرف دیکھا اور اپنے سر کے بالوں کو جھٹک کر ٹھیک کرتے ہوئے سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

اُس کا ہاتھ اب تک گیر کی مُٹھی پر رکھا تھا۔

اُس کے ہاتھ کے اُوپر اب تک میرا بھی ہاتھ رکھا تھا۔

اِس طرح ایک دوسرے کے ہاتھ کو پکڑے ہوئے ہم ایک دوسرے کے بندھن میں بندھتے جا رہے تھے۔ ہماری آنکھیں ایک دوسرے سے عہد و پیمان کر رہی تھیں۔

آخر ہمارے دِلوں کی آواز زبان پر بھی آ گئی۔ میں نے کہا ''میں ہمیشہ کے لیے تمہارا ہو جانا چاہتا ہوں۔''

''میں تو پہلے ہی ہمیشہ کے لیے آپ کی ہو چکی۔''

''لیکن ایک مجبوری ہے۔'' میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ''میں چار بچوں کا باپ ہوں۔''

''یہ کوئی مجبوری نہیں۔ میں خود چار بچوں کی ماں ہوں۔''

اُس رات اپنی اپنی آنکھوں میں ایک نشہ سا بھر کر جب ہم دونوں پلنگ پر لیٹنے لگے تو میں نے اپنی بیوی سے کہا۔ ''اِس طرح کا ڈھونگ رچانے سے ہماری چالیس سالہ شادی شدہ زندگی میں مٹھاس بھر گئی ہے۔''

''جوانی لوٹ آئی ہے۔''

یہ کہتے ہوئے میری بیوی بتّی بجھانے کے لیے سوچ ٹٹولنے لگی۔

○○○

ہزاروں خواہشیں ایسی

کِن مِن شروع ہوئی تو موسم سُہاونا ہوگیا۔ ایسے میں جی چاہا کہ گرما گرم پکوڑے ہوں، چائے ہو اور کچھ تلی ہوئی تیکھی ہری مرچیں ہوں تو جی خوش ہو جائے۔ دِل نے اپنی اِس خواہش کو چہرے پر لکھ دِیا۔ میں نے اس تحریر کو بیوی کے سامنے رکھ دِیا۔ لیکن پتہ نہیں وہ کِس تصور میں کھوئی کون سے پکوڑے تل رہی تھی کہ اُس نے میری طرف نظر بھر کر دیکھا بھی نہیں۔ چہرے پر لکھی تحریر پڑھنا تو دُور کی بات ہے، ممکن ہے اُسے موسم میں اچانک آئی تبدیلی کا بھی پتہ نہ چل پایا ہو۔

میں نے دو ایک بار اُس کی توجہ اپنی طرف اور بدلے ہوئے موسم کی طرف مبذول کرنی چاہی لیکن جب ہر طرح سے مجھے ناکامی ہی ہاتھ لگی تو میں نے وہی کیا جو اکثر بیوی کی طرف سے کورا جواب ملنے پر کیا کرتا ہوں۔ اپنی آنکھیں بند کیں، تصور کی دُنیا بسائی، ماضی کے دروازے پر بھاری قفل لگایا، حال کی کُنڈی چڑھائی اور مستقبل کے پٹ پر دستک دے دی۔

دروازہ میری چہیتی نٹنی نے کھولا۔ اس نٹنی کو میں نے اپنے بچپن میں دیکھا تھا۔ میرے لیے وہ اُس وقت بھی جوان تھی، جوانی میں تو خیر وہ جوان تھی ہی، اور اب جب میں بڑھاپے کی ڈگر پر چلتا چلتا کافی آگے نکل آیا ہوں تب بھی وہ میرے تصور میں جوان ہی ہے۔ ویسے بھی حُسن تو سدا جوان رہتا ہی ہے۔

مجھے اپنے گھر آیا دیکھ کر اُس کا حُسن اور دوبالا ہو گیا اور اُس کے ہونٹوں پر وہی مسکراہٹ بکھر گئی جو کوئی معنی خیز لوک گیت گاتے ہوئے اُس کے وجود کے انگ انگ میں

تھرکن بھر دیتی تھی۔ بچپن کی سُنی ہوئی وہی سُریلی آواز صدیوں لمبے ہجر کے فاصلے کو پاٹ کر میری سماعت سے ٹکرائی تو وہی مٹھاس میرے اندر بھی گھلنے لگی۔

میرا ماہی میرا خدا ہو
میرا اُسی سے ہونا نکاح ہو
میں اس کا نہ کھاتی وساہ ہو
میں مین تو وہ دریا ہو
میرا رب ہی میرا گواہ ہو۔

یہ گیت گاتے گاتے اُس کے پاؤں تھرکنے لگے تو میں نے سوچا کہ اگر اِس نے ناچنا شروع کر دیا تو میں سُدھ بُدھ بھول جاؤں گا، اور میری پکوڑے کھانے کی خواہش دِل ہی دِل میں دھری رہ جائے گی۔ ایسے میں اگر کن مِن بند ہوگئی اور موسم کا رنگ بدل گیا تو سارا مزا ہی کرکرا ہو جائے گا۔ یعنی حال سے مستقبل کا تمام سفر بے کار۔ اِس لیے میں نے برسرِ مطلب آتے ہوئے کہا۔

بھئی سُہاونے موسم میں پکوڑے کھانے کو جی چاہ رہا تھا۔ اس لیے تمہارے پاس آیا ہوں۔

اُس کے تھرکتے ہوئے پاؤں رُک گئے۔ ''پکوڑے تو نہیں مکّے اور باجرے کا کھچڑ بنا رکھا ہے کہو۔ تو وہ کھلاؤں۔ ساتھ ہی اُونٹنی کا دودھ بھی پلاؤں گی۔ گرما گرم۔ یہ کہتے ہوئے وہ اپنے تنبو کی طرف مُڑنے لگی۔

''نہیں۔ اِس کی ضرورت نہیں۔'' میں نے کہا۔

''زندگی میں پانی کی پیاس دودھ سے نہیں مٹائی جا سکتی۔'' یہ سوچ کر میں پھر حال میں لوٹ آیا۔ اپنی بیوی کی طرف اُمید بھری نظروں سے دیکھا۔ اُس کے سامنے اپنے چہرے کی تحریر رکھی۔ لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ اُس وقت وہ اپنی ممتا کے موتی اُس ننھے سے سویٹر میں پرو رہی تھی جو وہ اپنے پوتے کے لیے بن رہی تھی۔ موتی پروتی جا رہی تھی اور مُسکراتی جا رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے لبالب بھرے دِل کے مانسرور سے خوشی کی لہریں چھلک

چھلک کر اُس کے چہرے کو بھگو رہی ہوں۔ ایسے میں میری پکوڑے کھانے کی خواہش کو وہ کیسے سمجھ سکتی تھی؟

اس لیے میں نے پھر ماضی کو قفل لگایا، حال کے دروازے پر کنڈی چڑھائی اور اگلے مستقبل کے پٹ پر دستک دے دی۔

اب کی دروازہ میرے بیٹے نے کھولا، اور مجھے دروازے پر ہی روکتے ہوئے بولا۔

''ڈیڈی۔ ممی تو اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ ہنی مون پر چلی گئی ہے.....وہ کئی دِنوں سے آپ کا انتظار کر رہی تھی۔ پہاڑ پر اُس نے بنگلہ بھی کرائے پر لے لیا تھا۔ اُس کے لیے ایڈوانس بھی دے چکی تھی۔ کہنے لگی کہ اگر نہیں جاتی تو ساری رقم ضائع ہو جائے گی۔ تمہارے ڈیڈی تو بس.....

میں حیران۔ ہنی مون پر وہ اب گئی ہے۔ میں آیا نہیں۔ میرا بیٹا پہلے ہی پیدا ہو کر جوان بھی ہو گیا۔

میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ میں دروازے پر ہی کھڑا کھڑا اسی گتھی کو سلجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ بیٹا بولا۔ ''ڈیڈی۔ معاف کرنا۔ میری گرل فرینڈ اندر انتظار کر رہی ہے۔ ایسے سُہانے موسم کے پل پل سے ہم رس نچوڑ لینا چاہتے ہیں۔''

یہ کہتے ہوئے اُس نے گھر کا دروازہ کھٹاک سے بند کیا تو میں پھر اپنے حال میں پہنچ گیا۔ اُس وقت میری بیوی کے ہونٹوں پر کسی لوری کے بول تھرک رہے تھے۔

سونے کا ایک تھال
اُس میں جڑے ہیں ہیرے لعل
کھیر کھاوے بال گوپال
اور وہ جیئے ہزاروں سال

میری بیوی اپنی دُھن میں یگوں یگوں تک آنے والے بچوں کو گود میں کھلاتی اُنہیں ہزاروں سال تک جینے کی دُعائیں دے رہی تھی۔ ایسے میں میری بات کی رسائی اُس تک کیسے ہو سکتی تھی۔

اس لیے اپنی پکوڑے کھانے کی خواہش کو پورا کرنے کے لیے میں نے اُس سے بھی اگلے مستقبل کے پٹ پر دستک دے دی۔

اپنی چاہت والی عورت کو گھر پر ہی دیکھ کر مجھے تسکین بھی ہوئی۔ دروازہ اُسی نے کھولا تھا۔ وہ نشے میں تھی۔ اُس نے ایک ہاتھ میں لبالب بھرا جام تھام رکھا تھا۔ اُس کے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے۔ لیکن اُس حالت میں بھی اُس نے مجھے پہچان لیا اور اپنے پیچھے پیچھے آنے کا اِشارہ کر کے صوفے پر دھم سے بیٹھ گئی۔ ایک ہی سانس میں اُس نے آدھا گلاس خالی کیا۔ اُسے میز پر رکھتے ہوئے اپنی دلفریب ادا سے میری طرف دیکھا جس پر کبھی میں مرمٹا تھا۔

اس سے میرے اندر کچھ اُمید کی کرن پیدا ہوئی۔ ابھی میں گرم گرم پکوڑوں کی فرمائش کرنے ہی والا تھا کہ اُس کے تیور بدل گئے۔

''تم تو ایک ہفتہ پہلے آنے والے تھے۔'' اُس نے بڑی گہری نظر سے میری طرف دیکھا۔

''وہ۔ وہ... اُس کے بجائے میری زبان لڑکھڑا گئی۔ وہ.... ہوا یہ کہ... میں لفظ تلاش کرنے لگا۔

''کیا ہوا؟'' اُس نے گولی مارنے کے انداز سے سوال داغا۔

''ہوا یہ کہ پچھلے جنم میں میرے دفنانے میں دیر ہوگئی۔ میرا بیٹا کہیں پکنک پر گیا ہوا تھا۔ اُسے آنے میں دیر ہوگئی۔

''مرنے سے پہلے اُسے اِطلاع کیوں نہیں دی۔ غلطی تمہاری ہے۔''

یہ کہتے ہوئے اُس نے جام اُٹھایا اور غٹا غٹ پیتے ہوئے خالی کر دیا۔ پھر ہونٹوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ اب تو تمہاری جگہ کسی اور نے لے لی ہے۔ تم اپنا راستہ ناپو۔

اُس کی یہ بے رُخی دیکھ کر میرا دل ڈوبنے لگا تو ڈوبتے کو تنکے کا سہارا دیتے ہوئے وہ بولی۔

''خیر اب بوڑھوں کے لیے موت کوئی مسلہ نہیں رہ گئی ہے۔ مرنے سے پہلے وہ خود

ہی قبرستان چلے جاتے ہیں۔ نہ اُنھیں کسی کا انتظار نہ کسی اور کو پریشانی۔''

ایسا کہتے ہوئے وہ مجھے باہر کا راستہ دکھاتے ہوئے بولی: ''اس گلی کے سرے سے دائیں طرف والی سڑک سیدھی قبرستان جاتی ہے۔

میں قبرستان میں پہنچا تو ہر طرف قبریں ہی قبریں۔ کدھر جانا ہے، کہاں جانا ہے، کس سے پوچھوں۔ میں کھڑا کھڑا یہی سوچ رہا تھا کہ پھاٹک سے ایک اور آدمی قبرستان میں داخل ہوتا ہوا دِکھائی دیا۔ وہ میرے قریب آ کر بولا ''دفن ہونے کے لیے آئے ہو تو یہاں کیوں کھڑے ہو۔ یہ تو مردوں کا قبرستان ہے۔ زندہ لوگوں کو دفن کرنے والا قبرستان تو آگے ہے۔ میرے ساتھ ساتھ چلے آؤ۔ میں بھی اُدھر ہی جا رہا ہوں۔''

''ہے تو یہ ذاتی سوال۔ لیکن کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ زندگی میں ہی تم کیوں دفن ہونا چاہتے ہو۔'' میں نے اُس سے پوچھا۔

اگر اِنسان کو پل پل مرتے ہوئے زندگی گزارنی پڑے تو زندہ دفن ہونے میں کیا حرج ہے۔ اور پھر جب آدمی مرنے کے لیے قبرستان پہنچ جائے تو پھر کچھ بھی نجی نہیں رہ جاتا۔ اِس لیے آپ کو بتانے میں کیسی جھجھک؟ بات یہ ہے کہ میری بیوی کروڑوں کی جائیداد کی مالک بن کر اپنے کسی بوائے فرینڈ کے ساتھ گلچھرے اُڑانا چاہتی ہے۔ اِسی لیے دو ایک دفعہ اُس نے مجھے مارنے کی بھی کوشش کی۔ قائدے سے تو میرے دل میں اُس کے خلاف نفرت ہونی چاہیے تھی۔ لیکن دل ہے کہ مانتا ہی نہیں۔ میں پھر بھی اُس سے پیار کیے جا رہا ہوں۔

''.....آج بڑے لاڈ سے میرے گلے میں بانہیں ڈال کر اُس نے پوچھا۔'' کیا تم مجھے اپنے من کے میت کے ساتھ پیار کرنے کا موقع نہیں دو گے؟

بس اُس کا ایسا کہنا تھا کہ میرے دل میں اُس کے لیے پیار نے ایسا زور مارا کہ میں اُسی وقت زندہ دفن ہونے کے لیے گھر سے نکل پڑا۔

جب ہم زندوں کے قبرستان میں پہنچے تو وہاں بڑی چہل پہل تھی۔ پیڑوں کے ایک جھنڈ کے نیچے بیٹھے ہوئے لوگ خوش گپیوں میں مشغول قبر میں جانے کی باری آنے کا انتظار

کر رہے تھے۔ دراصل وہاں جگہ کم تھی۔ زندہ دفن ہونے والے زیادہ۔

اس لیے پتہ چلا کہ وہاں کئی لوگ تو سالوں سے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ ہاں وہاں اُن کے رہنے اور کھانے پینے کا پورا بندوبست تھا۔ اسی لیے اُن کے چہرے ایسے ہشاش بشاش تھے جیسے وہ اپنے گھروں کی نسبت زیادہ مطمئن ہوں۔

اس پر بھی... میں نے سوچا۔ یہاں سالوں تک انتظار کرنے کا کیا فائدہ۔ موسم بدل گیا تو پکوڑے کھانے کی خواہش میرے مرنے سے پہلے ہی دِل میں مر جائے گی۔ اس لیے میں وہاں سے نکلنے کا راستہ ڈھونڈنے لگا۔

اب کی جس پھاٹک سے میں باہر نکلا، وہاں سے کسی مستقبل کی جانب نہیں بلکہ حال کی طرف راستہ جاتا تھا۔

میں گھر پہنچا تو میری بیوی اُس وقت اپنے پوتے کے سوئیٹر کو سمیٹ کر الماری میں رکھ رہی تھی۔ وہ الماری بند کر کے ہٹی تو میں نے دیکھا کہ اب وہ اپنے پوتے کی دادی سے زیادہ میری بیوی لگ رہی تھی۔

میری بیوی بن کر اُس نے ایک اُچٹتی سی نگاہ مجھ پر ڈالی۔ مجھے اپنے خیالوں میں گم پا کر اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ممکن ہے اُس نے موسم کی تبدیلی کو بھانپ لیا ہو۔ وہ اُٹھی۔ اپنا شال اوڑھا، میرا شال کھول کر میری ٹانگوں پر ڈالا اور تھوڑی دیر بعد گرما گرم پکوڑے اور چائے کی ٹرے لیے وہ سامنے کھڑی مُسکرا رہی تھی۔

اپنی تخیل کی دُنیا سے باہر آ جاؤ۔ اور گرما گرم پکوڑے کھاؤ۔'' وہ کہہ رہی تھی۔ ہری مرچ کے ساتھ گرم پکوڑوں کا لُطف اُٹھاتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ میری بیوی کے سامنے میری چاہت کی دُنیا کس قدر پھیکی اور کھوکھلی ہے۔''

تبھی میری بیوی مُسکرائی۔

اور موسم اور زیادہ خوشگوار ہو گیا۔

○○○

ایک ضروری کام

ایک نہایت ضروری کام کو میں ایک عرصے سے ٹال رہا تھا۔ ایسا محض اس لیے ہو رہا تھا کیونکہ میں سمجھتا تھا کہ جو سکون اس ضروری کام کو کرنے کے لیے درکار ہے وہ ابھی میسر نہیں ہے۔ میرا خیال تھا کہ پریشانی کے عالم میں اس کام سے انصاف نہیں کر سکوں گا۔

میری بیوی آئے دن اس کام کے بارے میں یاد دلاتی تو میرا جواب ہوتا۔ ''دیکھو یہ کام بہت ضروری ہے۔ میں اسے پورے سکون سے کرنا چاہتا ہوں تاکہ غلطی کا کوئی امکان نہ رہ جائے۔''

میری بیوی جواب سن کر خاموش ہو جاتی۔

مجھے خود بھی کبھی اس ضروری کام میں ہو رہی دیری کا احساس ہوتا تو پریشان ہو جاتا۔ اور اپنے آپ کو یہی کہہ کر تسلی دے لیتا کہ بس ذرا حالیہ پریشانیوں سے نجات مل جائے تو پھر اس کام کو سب سے پہلے کروں گا۔ ایسا سوچتے ہوئے کبھی اطمینان ہو جاتا۔ کبھی نہ ہو پاتا۔

''کہیں تم اس کام سے من چرا تو نہیں رہے؟

کہیں ایسا تو نہیں کہ تم اس کام کو کرنا ہی نہیں چاہتے؟''

کبھی کبھی میرے اندر کا منصف میرے سامنے کھڑا ہو کر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس طرح کے سوال کر دیتا۔

''نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ کام کی اہمیت کو میں سمجھتا ہوں۔ اس بات کا بھی احساس ہے کہ اسے مزید ٹالنا مناسب نہیں۔ بس ذرا ذہنی سکون میسر ہو تو.....

ایسے موقعوں پر میری ذہنی پریشانیاں میری ڈھال بن جاتیں۔ وہ بول اٹھتیں۔ ضروری کاموں کو کرنے کے لیے مکمل اطمینان بھی ہونا چاہیے تا کہ آدمی صاف ذہن سے سوچ سمجھ کر انہیں کر سکے۔

میرا مُنصف یہ سن کر خاموش ہو جاتا۔

اور میں اطمینان کی سانس لیتا۔

لیکن وقتی پریشانیاں تھیں کہ غریب کے مسئلوں کی طرح بڑھتی ہی جا رہی تھیں۔ اور ان کا کوئی بھی حل نہیں نکل رہا تھا۔ میری کیفیت ایسی ہو رہی تھی جیسے ایک بار ببول کی کانٹے دار جھاڑیوں میں الجھ جانے پر ہوئی تھی۔

وہ جو بنے بنائے راستوں سے ہٹ کر اپنے لیے نئے راستے پر چلنے کی میری عادت ہے نا اسی وجہ سے میں ان کانٹے دار جھاڑیوں میں الجھ گیا تھا۔ ایک گلہری پتا نہیں کیسے ان جھاڑیوں کے نیچے پھنس کر رہ گئی تھی۔ وہ اِدھر سرکتی، اُدھر سرکتی اور پھر کانٹوں میں الجھ کر رہ جاتی، بس اسی کو نجات دلانے کے چکر میں، میں خود اس میں پھنس کر رہ گیا۔ دائیں طرف سے پاجامے کو چھڑاتا تو بائیں طرف سے الجھ جاتا۔ بائیں طرف سے ابھی نجات نہ ملتی کہ دائیں طرف کانٹے گڑنے لگتے۔ کانٹوں کی چبھن سے میری ٹانگوں میں ایسا درد ہو رہا تھا جیسے بچھو ڈنک مار رہے ہوں۔ بازو بھی لہولہان ہو رہے تھے۔ قمیض کی آستین پھنسی سو الگ۔ پریشان ہو کر میری آنکھوں میں آنسو آنے ہی والے تھے کہ بستر کی طرف پانی بھرنے کے لیے آئی حمیدن نے مجھے دیکھ لیا۔ اس نے گھڑا زمین پر رکھا اور مجھے جھاڑیوں سے نکالا اور گلہری کو بھی۔

ان کانٹوں سے تو اس نے مجھے نکال لیا لیکن جاتے جاتے ایک اور کانٹا وہ مجھے چبھو گئی۔ یہ اب تک میرے دل میں چبھا ہوا ہے۔ نہیں میں اس کانٹے کی بات نہیں کروں گا۔ بڑا ذاتی مسئلہ ہے۔ اس کے بارے میں کچھ نہ پوچھیے۔

پوچھنا ہے تو ضروری کام کی بات پوچھئے جسے میں وقتی پریشانیوں کی وجہ سے ٹالے جا رہا تھا۔ ان دنوں مجھے عجیب عجیب سے ایک ہی طرح کے سپنے آتے تھے۔ ابھی کچھ دن

پہلے جو سپنا آیا تھا، وہ آپ کو سناتا ہوں۔

ایک نہایت خوبصورت ریل گاڑی ہے۔ اس کے سفید رنگ کے ڈبے ہیں۔ وہ پٹری پر چلتی ہوئی ایسے لگتی ہے جیسے سپنے میں دیکھی ہوئی گاڑی کی خوبصورتی کو، کسی سپنے میں دیکھی ہوئی شے سے ہی تشبیہہ دی جا سکتی ہے۔ اور کبھی ایسا خوبصورت سپنا میں نے زندگی میں دیکھا ہی نہیں۔ ہاں تو وہ گاڑی کسی اُجاڑ سے اسٹیشن پر رُکی۔ پتہ نہیں میں وہاں پر کیوں اترا۔ پلیٹ فارم پر کھڑا تھا کہ میرے دیکھتے دیکھتے دھڑام کی سی آواز آئی۔ جدھر سے آواز آئی۔ اُدھر دیکھا۔ پلیٹ فارم سے ملحقہ کوئی عمارت گر گئی تھی۔ میں گرتے ہوئے ملبے کی طرف دیکھ ہی رہا تھا کہ اچانک مجھے اپنی گاڑی کا خیال آیا، پلٹ کر دیکھا تو گاڑی چل دی تھی۔ میں دوڑ کر گاڑی کی طرف لپکا۔ لیکن گاڑی کا آخری ڈبہ مجھ سے دس قدم دور تھا اور اس کی رفتار ہر لمحے تیز ہوتی جا رہی تھی۔

مایوسی کے عالم میں گاڑی کو اگلے اسٹیشن پر پکڑنے کے خیال سے میں نے اپنے آپ کو ایک گدھے پر سوار پایا جو پٹری کے ساتھ ساتھ گھنے جنگل کے بیچ دوڑتا ہوا ادھر جا رہا تھا جدھر میری خوبصورت آرام دہ گاڑی گئی تھی۔ گدھے پر بیٹھ کر بھی خوش تھا کہ آخر میں اپنی منزل کی طرف بڑھ تو رہا ہوں۔ تبھی میں نے دیکھا کہ گدھا ایک بہت بڑے سانپ کے پاس سے نکل گیا۔ وہ تو غنیمت ہوئی کہ سانپ نے پھن نہیں اُٹھایا تھا۔ ورنہ پتہ نہیں کیا ہو جاتا۔ جنگل مزید گھنا ہوتا جا رہا تھا۔ جنگل میں آنے والے دوسرے خطروں کو بھانپ کر میں نے گدھے کو واپس موڑ لیا۔

سپنے کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ صرف اتنا بتا دینا ہی کافی ہے کہ صبح جب میں جاگا تو سپنے کی جو تعبیر ذہن میں آئی وہ یہ تھی کہ چونکہ میں اپنے ضروری کام کو ٹالتا آ رہا ہوں اس لیے لگتا ہے کہ زندگی کی کسی بڑی منزل کی طرف جانے والی خوبصورت گاڑی کسی اجاڑ راستے میں مجھے چھوڑ کر آگے بڑھ گئی ہے۔

یہ سوچ کر میں مزید اداس ہو گیا۔ تبھی مجھے خیال آیا کہ یہ گاڑی چھوٹنے والا سپنا میرا پہلا سپنا نہیں ہے۔ اس طرح کے سپنے مجھے پہلے بھی آتے رہے ہیں۔ صرف سپنے کے

واقعات اور ہوتے ہیں۔لیکن ہر بار ہوتا یہی تھا کہ میری گاڑی چھوڑ کر آگے بڑھ جاتی تھی۔

ایسے میں نیند کھلنے پر میں پریشان سا ہو جاتا تھا۔اور گدھے کی طرح بیوقوف بنا اپنے پاؤں کے نیچے کی زمین کی طرف دیکھنے لگتا تھا۔سوچتا رہتا تھا کہ دوسرے لوگ آگے بڑھ رہے ہیں میرے نیچے کی زمین آگے کیوں نہیں بڑھ رہی ہے۔

ان پرانے سپنوں کا خیال آتے ہی میرے ذہن میں یہ خیال جڑ پکڑ گیا کہ یہ سب کے سب سپنے بار بار مجھے یہ یاد دلا رہے ہیں کہ میں اپنا ضروری کام نہیں کر رہا ہوں اور اسی وجہ سے زندگی کی گاڑی مجھے بیچ راستے میں چھوڑ کر.....

اس خیال نے ایک طرح سے مجھے جھنجھوڑ ڈالا اور ایک دن میں نے اپنے آپ کو ''خوب ڈانٹا'' یہ کیا ہے کہ میں وقتی الجھنوں کی وجہ سے اپنے اتنے ضروری کام کو کرنے سے منہ چرا رہا ہوں۔

اس کے بعد میں نے اپنے دل میں پکا فیصلہ کر لیا کہ اب میں اس کام کو فوراً کر ڈالوں گا۔بیوی کو بھی میرا فیصلہ سن کر خوشی ہوئی اور میری حوصلہ افزائی کرتی ہوئی اس وقت کا انتظار کرنے لگی کہ میں اپنا کام کب شروع کرتا ہوں۔

وقت نے بھی جیسے میرے حق میں کروٹ لی۔

میرے وقتی مسئلے نہ صرف پلک جھپکنے میں حل ہو گئے بلکہ میری زندگی میں نہایت خوش گوار تبدیلی آ گئی۔

جیسے تپتے ریگستان میں اچانک ٹھنڈے میٹھے پانی کے چشمے پھوٹ پڑیں اور ایک عمر کے پیاسے کسی مسافر کا سینہ ٹھنڈا ہو جائے، جیسے صدیوں سے جل رہی سوکھی بنجر زمین پر اچانک گھنگھور بادل برسیں اور ہر طرف جل تھل ہو جائے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ زمین جس پر دھول اُڑ رہی ہو، وہ سبزہ زار بن جائے اور ہری بنسپتی کی خوشبو سے ہوائیں نشیلی ہو جائیں۔جیسے بیر بہوٹیاں لال ریشمی کپڑوں میں ملبوس زندگی کی سیر کو نکل پڑیں۔

ہاں کچھ ایسا ہی میری زندگی میں ہوا۔آبِ زم زم پھوٹ پڑا اور میں زندگی کی راحتوں اور مسرتوں سے بھیگ بھیگ گیا۔ایسے لمحے آئے کہ میری ذہن نے پرواز بھری اور میرے

تن کے لیے عرش بریں سے خوشیوں کے مہکتے پھول لے آیا۔ ان پھولوں کی خوشبوؤں نے میرے تن کو تو مہکایا ہی، میرے من کو بھی مہکا دیا۔

ان خوشبوؤں کی لذت کو اپنی بند آنکھوں میں سموئے میں سکھوں کے جھولے جھول رہا تھا کہ میری بیوی نے مجھے ضروری کام کی یاد دلائی۔ اس کا کہنا تھا کہ اب موقع ہے۔ اس ضروری کام کو فوراً کر ڈالوں۔

''اس کا کہنا واجب ہے۔'' میرے من نے کہا۔ میرے ذہن نے مانا۔

میں نے بھی اپنے آپ سے کہا'' ہاں اب فرصت بھی ہے اور سکون بھی۔''

''عمروں لمبے دکھوں اور پریشانیوں کے بعد یہ جو سکھ کا ایک پل آیا ہے، یہ جو چند لمحے ملے ہیں، ان کا بھرپور آنند تو لینے دو۔''

میرے کانوں نے یہ جملہ سنا۔

لیکن یہ کس نے کہا تھا۔

ظاہر ہے وہاں میرے اور میری بیوی کے علاوہ تیسرا کوئی نہیں تھا۔ اور میری بیوی خاموش کھڑی تھی۔

اس کا مطلب ہے۔ میرے ہی ہونٹوں نے یہ جملہ ادا کیا تھا۔ میں نے ہی یہ بات اپنی بیوی سے کہی تھی۔ اور غالباً اپنے آپ سے بھی۔

رہا وہ ضروری کام۔ ظاہر ہے وہ اب بھی شروع نہیں ہو سکا۔ پس پشت پڑا ہے۔

جب بھی اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ اپنا ضروری کام میں نے ابھی تک شروع نہیں کیا تو ایسے لگتا ہے جیسے میں اپنے آپ کو کانٹوں پر گھسیٹ رہا ہوں۔

ایسے میں میرا تن من درد سے نہا جاتا ہے۔

○○○

زندگی کے رنگ

خوشبوؤں میں نہائی وہ عورت اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ لیے آئی تو تھی مجھے خوشخبری سنانے۔ حالانکہ اُسے پتہ نہیں تھا کہ وہ اپنے آنچل میں میرے لیے ایک اُداس لمحہ بھی سمیٹ لائی ہے۔

اور اب وہ اُداس لمحہ مجھے اپنے اندر سمیٹ کر اندھیروں کی طرف یوں دھکیل رہا ہے، جیسے پیڑ سے گرے ہوئے سوکھے پتوں کو بہار کر کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دیا جاتا ہے، اور پھر اُن کی ہستی مٹی کا ڈھیر بن جاتی ہے۔

اُس عورت نے میرے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی کہا تھا:

''مبارک ہو جی!'' ہماری کمپنی نے آپ کو انعام دینے کے لیے چنا ہے۔''

''کیسی کمپنی؟ کون سا انعام؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''جی ہماری ٹورسٹ کمپنی نے اپنے پرانے گاہکوں میں سے خاص طور پر آپ کو چنا ہے اور انعام یہ ہے کہ اب جب آپ کسی غیر ملکی سفر پر جائیں تو آپ اپنی بیوی کے ہمراہ کسی بھی پانچ ستارہ ہوٹل میں کمپنی کے خرچ پر چھ دن اور سات راتوں کے لیے رہ سکتے ہیں۔''

''بڑی اچھی خبر ہے۔'' میں دو مہینے بعد امریکہ جا بھی رہا ہوں۔

''یہ تو کمپنی کے لیے بھی بڑی خوشی کی بات ہوگی۔ ہم بھی یہ خرچ اسی مالی سال میں ادا کرنا چاہتے ہیں۔''

''اور اگر کسی وجہ سے میں اگلے سال جاؤں تو؟''

تب بھی کوئی بات نہیں۔ یہی پیسہ دوسرے مالی سال کے خرچے میں ڈال دیا جائے

گا۔بس ہمیں پتہ ہونا چاہیے کہ آپ کہاں جا رہے ہیں اور کب۔

یہ کہتے ہوئے وہ اپنا بیگ کھول کر ایک فارم بھرنے لگی۔ میرے نام کے ساتھ امریکہ کے شہر کا نام بھرنے کے بعد پوچھا۔ جی آپ اپنی پیدائش کی تاریخ بتا دیں۔

نومبر 1927ء

''یعنی آپ کی عمر اسّی سال کی ہے۔''

یہ کہتے ہوئے اس کے چہرے کی مسکراہٹ دیئے کی مدھم پڑتی لو کی طرح پوری کی پوری بجھ گئی۔

''تب تو یہ انعام آپ کو نہیں دے پائیں گے۔ یہ تو صرف ساٹھ تک کی عمر والوں کے لیے مخصوص ہے۔''

اور اس طرح اپنے چہرے پر آئی مایوسی کو میرے چہرے پر پوتتے ہوئے اس نے اپنا بیگ بند کیا اور چلی گئی۔

مجھے مایوسی اس بات کی نہیں تھی کہ دوسرے کے پیسے سے ایک ہفتے کی آسائش سے محروم ہو گیا۔ میری عمر تک پہنچ کر اس قسم کے چھوٹے موٹے نفع نقصان کی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی اسی لیے ایسی باتوں کا میں کوئی اثر قبول نہیں کرتا۔

افسوس تھا تو اس بات کا کہ محض اسّی سال کا ہو جانے کی وجہ سے دُنیا مجھے ایسی خوشیوں کے قابل نہیں سمجھتی کہتی ہے۔

''ہو گئے تم بوڑھے کھوسٹ۔ اب زندگی کے لیے تم کسی کام کے نہیں رہ گئے۔''

''یہ تو مجھے زندگی سے خارج کر دینے والی بات ہوئی۔

پھر یہ کہ اس قسم کا یہ پہلا واقعہ نہیں تھا۔ تین چار بار پہلے بھی میرے ساتھ ایسا ہی برتاؤ ہو چکا ہے۔ ہر دفعہ اسے معمولی بات سمجھ کر میں بھول گیا تھا۔

میں تو بھول گیا تھا۔ لیکن لگتا ہے کہ میرے دل میں کہیں احتجاج کی آگ سُلگ رہی تھی۔ اس واقعے نے اس سُلگتی آگ کو ہوا دے کر بھڑکا دیا۔ اس الاؤ میں چھوٹے چھوٹے شعلے اُبھرے تو اُن کی روشنی میں پرانے سارے واقعات ایک ایک کر کے چمک اُٹھے۔

مجھے یاد آیا۔ اُس روز میں اپنے بینک سے باہر آیا تو اُس بینک کا کریڈٹ کارڈ بیچنے والے ایجنٹ نے پہلے تو بڑی گرمجوشی سے مجھے بٹھایا۔ کریڈٹ کارڈ کے فائدے بتائے میں نے اِسے بنوانے میں دلچسپی دِکھائی تو اپنے چہرے پر اچھے سیلز مین والی مسکراہٹ چپکا کر فارم بھرنے کے لیے دوسرے کمرے میں لے گیا۔ میرے بیٹھنے کے لیے خود کرسی کھینچ کر لایا۔ نام باپ کا نام، بینک اکاؤنٹ نمبر وغیرہ بھرنے کے بعد اُسے پتہ چلا کہ میری عمر اسّی سال کی ہے تو اُس کے ہاتھ سے قلم یوں چھوٹ گیا جیسے میں نہیں وہ اسّی سال کا ہو گیا ہو۔

''کریڈٹ کارڈ تو ہم صرف پینسٹھ سال تک کی عمر والے لوگوں کو ہی دے سکتے ہیں۔''

تب بھی میں نے محسوس کیا تھا کہ اسّی سال کا ہو جانے کی وجہ سے جیسے زندگی کا مجھ پر اعتبار اُٹھ گیا ہو۔

کچھ اسی قسم کی مایوسی میڈیکل اِنشورنس اور مکان بنوانے کے لیے قرض دینے والے اداروں نے میری جھولی میں ڈالی تھی۔

اِن واقعات کو میں یکسر بھول چکا تھا۔

لیکن آج کے واقعے نے جیسے پرانے زخموں کو کرید دیا۔

جیسے جوتے کی ایڑی کی کوئی کیل رہ رہ کر چبھتی ہے، درد کی ٹیس پیدا کرتی ہے، جیسے کسی دوست رہ چکے دشمن کی باتیں، نوکیلی اَنی کی طرح دل میں چبھتی رہتی ہیں چپکے چپکے، اسی طرح یہ سب واقعات میری بے چینی میں اضافہ کر رہے تھے۔

اس مایوسی سے ملنے والی مجموعی مایوسی دھیرے دھیرے پرت در پرت گہری ہوتی چلی گئی اور مجھے ایسے لگا جیسے گہرے گھنگھور بادلوں کی کالک میں میری ہستی پوری طرح گم ہوتی جا رہی ہو۔

میں نے سورج کو سمندر میں غروب ہوتے کئی بار دیکھا ہے۔

آخری لمحوں میں سورج لال ہو جاتا ہے۔

اور وہ لالی سمندر کی سطح پر یوں پھیلتی چلی جاتی ہے جیسے سورج جاتے جاتے اُس دِن کی

یادوں کو سطح سمندر پر نقش کر رہا ہو۔ اِس کے بعد سورج کا لال گولا پانی کو چھوتا ہے اور پھر دھیرے دھیرے ماضی کے سمندر میں ڈوبتا ہے تو بھی کافی دیر تک سورج کی زندگی لہروں پر چمکتی رہتی ہے۔

ایسے میں مجھے لگا کہ اب جب میری زندگی کے غروب کا وقت قریب آ رہا ہے تو مجھے زندگی یہ موقعہ نہیں دے رہی۔

اِس کے برعکس زندگی کی بے رُخی کہتی ہے۔ ''تمھاری پاری اب ختم ہوئی۔ کھیل کے میدان سے باہر ہوئے تو چپ چاپ زندگی کی حد سے بھی باہر ہو جاؤ۔

اور میں ماضی کے سمندر میں ڈوبتا جا رہا ہوں۔ سطح آب کی طرف لڑھکتے ہوئے کسی لہر کی طرف سہارے کے لیے دیکھتا ہوں تو وہ زور کا تھپیڑا مار کر مجھے نیچے کی طرف دھکیل رہی ہے۔ دوسری لہریں میرے ساتھ ہمدردی جتانے کے بجائے قل قل کرتی ہنستی ہیں، کوئی اِدھر سے دھکا مارتی ہے اور کوئی اُدھر سے، اور مجھے لگتا ہے، جیسے صدیوں سے جم رہی کائی میرے وجود کو اپنے میں گم کرتی جا رہی ہو۔

جہاں میں ہوں۔ وہاں سب کچھ ٹھہرا ہوا ہے۔

''وقت زندگی سب کچھ۔''

ایسے میں پل پل اُڑتا وقت میرے اردگرد برف کے گالوں کی طرح گرتا ہے اور پہلے سے جمی برف کے اُوپر جمتا جا رہا ہے۔

اگر میں اس کے نیچے دب کر رہ گیا تو میرے سارے احساسات، سارے جذبے، ساری ہستی، جیتے جی ہی ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جائے گی۔ ایسا سوچ کر مجھ پر کچھ گھبراہٹ سی طاری ہوئی تو پتہ نہیں کس خوف کے زیرِ اثر وہ تمام چہرے میری آنکھوں کے سامنے تیرنے لگے جو کبھی میری زندگی کا حصّہ تھے اور اب ہمیشہ کے لیے ماضی کے اندھیروں میں گم ہو چکے ہیں۔

میں نے محسوس کیا جیسے وہ سب کے سب ماضی کے اندھیرے میں پتھر پتھر ہو کر چار سو بکھرے ہوئے تھے۔

یہی دیکھ کر میں نے سوچا کہ میرے اِرد گرد جمع ہو رہے برف کے تودے اگر اور بڑے ہو گئے تو میں بھی اپنے عزیزوں کی طرح اِن میں گم ہو کر رہ جاؤں گا۔

اِس کیفیت سے باہر آنے کے لیے میں من ہی من کوشش کر ہی رہا تھا تو.....

جس طرح مچھلی پکڑنے والا، کانٹے میں پھنسی مچھلی کو ایک جھٹکے سے سوٹی اُٹھا کر اُسے کنارے پر لا پھینکتا ہے، ٹھیک اِسی طرح میری بیوی مجھے اِن اندھیروں سے باہر کھینچ لائی۔

''ایسے گم سُم کیوں بیٹھے ہو؟'' وہ مجھ سے پوچھ رہی تھی۔

جیسے کوئی ہڑبڑا کر جاگتا ہے۔ میں چونک پڑا۔

''اُس چھمک چھلو کے جانے کی وجہ سے آج کی اُداسی ہاتھ آئی ہے، اُسے فون کر کے نہیں بلایا جا سکتا۔ بیتی ہوئی عمر بھی کبھی لوٹ کر آتی ہے۔''

میں ابھی مایوسی کے اِسی عالم میں ڈوب اُبھر رہا تھا کہ تبھی ہمارے پڑوسی پچوری صاحب کا تین سال کا اگم چھوٹی سی کٹوری پکڑے کمرے میں آیا۔

''ممی نے کہا ہے۔ پاپا نے کہا ہے۔ پپی برتھ ڈے ہے۔ جاؤ دادا دادی کو پرنام کر آؤ۔''

یہ کہتے ہوئے اُس نے متھرا کے پیڑے کا ٹکڑا پہلے میرے منھ میں ڈالا اور پھر میری بیوی کے منہ میں۔

اُس کے بعد خالی کٹوری تپائی پر رکھ کر اگم میری ٹانگوں سے لپٹ گیا۔

میں نے پاؤں کو تھوڑا اُوپر اُٹھایا تو اُسے لگا جیسے وہ جھولا جھول رہا ہو۔ اُس کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

میں سمجھ گیا کہ اُسے مزا آ رہا ہے۔ ایک بار جھولا جھولنے کے بعد اُس کی مسکراہٹ کھلکھلاہٹ میں تبدیل ہو گئی۔ ٹانگوں کا جھولا جتنا اُونچا اُٹھتا تھا اُتنا ہی وہ زور سے ہنستا تھا۔

اگم کی اِس کھلکھلاہٹ سے میرے دل کا کنول بھی کھل اُٹھا اور میں بچہ بن کر اُس کے ساتھ کھیلنے لگا۔

یہ سب دیکھ کر میری بیوی بولی۔

آپ تو کہتے تھے کہ عمر لوٹ کر نہیں آتی۔ آپ کی جوانی تو کیا بچپن لوٹ آیا ہے۔ اِتنا کھل کر تو آپ کو اپنے بچوں سے بھی کھیلنے کا موقعہ نہیں ملتا تھا۔ صبح دفتر جانے کی جلدی اور شام کو تھکے ہونے کا بہانہ—

وہ ایک پل کے لیے رُکی۔ ''میں تو کہتی ہوں۔ ہماری جوانی تو اب آئی ہے۔ جوانی میں تو پاس بیٹھنے کی فرصت ہی نہیں ملتی تھی۔

''سچ کہہ رہی ہو۔'' میں بھی اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ بڑھاپا تو ساری عمر کی ریاضت کا، تپسیا کا انعام ہے۔ زندگی کا سنہری حصّہ۔

اور یہ انعام تمھاری چھمک چھلو کے انعام سے لاکھ درجے اچھا ہے۔

○○○

خبر، حقیقت اور افسانہ

''خبر''

اوشیر نام کا ایک چھوٹا سا اسرائیلی بچہ، فلسطینی چھاپہ ماروں کے حملے میں شدید طور پر زخمی ہوگیا۔

یعقوب نام کا چھوٹا سا فلسطینی بچہ، اسرائیلی بمباری میں شدید طور پر زخمی ہوگیا۔

دونوں زخمی بچے ایک فوجی اسپتال میں اپنے لیے زندگی اور موت کی لڑائی لڑ رہے ہیں۔

طبی ضرورتوں کے مدِ نظر دونوں بچے ایک ہی وارڈ میں ہیں اور اُن کے پلنگ بھی ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ ہیں۔

حقیقت

دونوں بچے ایک سی کیفیت کا سامنا کر رہے ہیں۔

دونوں کے جسموں پر جگہ جگہ پٹیاں بندھی ہیں۔

درد کی ٹیس اُٹھتی ہے تو دونوں کراہتے ہیں۔

کبھی ایک کراہتا ہے، کبھی دوسرا۔ کبھی دونوں ایک ساتھ۔

کبھی کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ ایک کراہتا ہے، تو دوسرے کا درد جاگ اُٹھتا ہے۔

کبھی ایک کو تھوڑا سکون ملتا ہے تو دوسرا بھی راحت محسوس کرتا ہے۔

ایک سی کیفیت نے دونوں بچوں کے درمیان درد کا ایسا رشتہ استوار کر دیا ہے، جسے آپ کوئی نام نہیں دے سکتے۔

لیکن دونوں کے ماں باپ بچے نہیں ہیں۔

وہ بالغ ہیں۔

دونوں جانتے ہیں کہ وہ دو ایسے ملکوں کے باشندے ہیں جو عرصے سے ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہیں۔

دونوں کو شکایت ہے کہ اُن کا بچہ دوسری قوم کے حملے کا شکار ہوا ہے۔

دونوں کے دلوں میں دوسری قوم کے لیے غصّہ ہے، نفرت ہے۔

اپنے بچے کی کراہیں سُن کر اُن کا دل تڑپتا ہے۔

دوسرے بچے کی کراہیں سُن کر اُنھیں اُلجھن ہوتی ہے۔

وہ اپنے بچے کے پاس دوسرے کی موجودگی کو برداشت نہیں کر پاتے۔

وہ سوچتے ہیں کہ سانپ کا بچہ اُن کے بچے کے پلنگ کے پاس کیوں رکھا گیا ہے؟

وہ ڈاکٹروں سے، اپنے بچے کو دوسری جگہ منتقل کرنے کے لیے زور دیتے رہتے ہیں۔

لیکن ڈاکٹر ایسا نہیں سوچتے۔ اُن کے لیے کوئی بچہ نہ فلسطینی ہے نہ اسرائیلی۔ اُن کے لیے دونوں زخمی ہیں اور اُن کا علاج کرنا اُن کا فرض۔

وہ کسی بچے کو دوسری جگہ منتقل کرنے کے لیے تیار نہیں۔

ویسے بھی زخمیوں کا علاج کرنے کے لیے جو سہولتیں اس وارڈ میں مہیا ہیں، وہ دوسری جگہ نہیں ہیں۔

افسانہ

نرس ابھی ابھی دونوں بچوں کی مرہم پٹی کر کے گئی ہے۔ مرہم پٹی کے بعد دونوں کے زخمی حصّوں کے درد جاگ گئے ہیں۔

دونوں اس درد کو اندر ہی اندر برداشت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن درد کی ٹیسیں ہیں کہ آنکھوں میں اکٹھی ہو کر پلکوں کو نم کیے دے رہی ہیں۔ ہونٹوں پر آ کر ''ہائے'' کی آواز میں تبدیل ہو رہی ہیں۔

ایسے میں ایک بچے نے بھیگی پلکوں کے نیچے سے دوسرے بچے کی طرف دیکھا۔

مجھ سے تو یہ درد برداشت نہیں ہو رہا۔ تمہارا کیا حال ہے۔

دوسرا اُس کی زبان نہیں سمجھتا تھا۔ انسانی درد کی زبان ایک ہی ہوتی ہے، جو الفاظ، ہیئت اور معنی کی حدوں کو توڑ کر دوسرے کے دِل تک اپنا مفہوم پہنچا دیتی ہے۔

دوسرا بچہ سمجھ گیا کہ وہ اُس کی خیریت پوچھ رہا ہے۔

''تمہارے جیسا حال میرا بھی ہے۔''

کیا ہم بچ جائیں گے؟ ایک نے ڈرتے ڈرتے دوسرے سے پوچھا۔

دوسرے نے چھت کی طرف دیکھا۔ جیسے کہنا چاہتا ہو کہ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

دونوں بچوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر، ایک دوسرے کی حوصلہ افزائی کرنے کے لیے، یا اپنا دل رکھنے کے لیے مسکرانا چاہا۔ مگر دونوں ناکام رہے۔

پھر اپنے اپنے درد کو برداشت کرنے کی کوشش کرنے لگے۔

جس وقت یہ ہو رہا تھا، اُس وقت دونوں بچوں کے ماں باپ ڈاکٹر کے کمرے میں اُس سے جھگڑتے ہوئے ایک دوسرے کی طرف قہر بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

کہاں تو ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے بچے کو سنپولے سے الگ رکھا جائے..... اور آپ ہیں کہ دنیا پر اپنی انسان دوستی کا دعویٰ کرتے ہوئے، دونوں کی تصویریں ایک ساتھ چھپوا رہے ہیں۔

میرے بچے کو دشمن کے بچے ساتھ رکھنے کا حق آپ کو کس نے دیا؟

دشمن، دشمن ہی ہوتا ہے۔ جو نہتوں پر گولے برساتے ہیں، وہ میرے بچے پر وار بھی کر سکتے ہیں۔

کبھی ایک الزام لگاتا تھا۔

کبھی دوسرا۔

ڈاکٹر اپنی مجبوری بیان کر رہا تھا، جسے سُننے سمجھنے کے لیے اُن میں سے کوئی بھی تیار نہیں تھا۔

اِتنے میں نرس بھاگتی ہوئی آئی۔

سر۔ایک بچے کی سانس اُکھڑ رہی ہے۔

ڈاکٹر اُسی وقت اُٹھا اور وارڈ کی طرف چل دیا۔

''خدایا میرا بچہ خیریت سے ہو۔''

''خدایا میرا بچہ خیریت سے ہو۔''

اپنے اپنے خدا سے، اپنے بچے کے لیے دُعا مانگتے ہوئے وہ ڈاکٹر کے پیچھے بھاگ رہے تھے کہ نرس نے اُنھیں وارڈ کے اندر جانے سے روک دیا۔

اُن کو یہ پتہ نہیں تھا کہ کس بچے کی حالت نازک ہے۔اس لیے دونوں کی جان سوکھی ہوئی تھی۔

اپنے اپنے بچے کے لیے فکر میں ڈوبے، پتہ نہیں اُن کو کتنی مدت گزر گئی۔اُن کے لیے ہر بیتا ہوا لمحہ سالوں لمبا ہوتا جا رہا تھا۔۔

آخر خدا خدا کر کے آدھ گھنٹے بعد ڈاکٹر باہر آیا۔

گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔خطرہ ٹل گیا ہے۔

دونوں نے اطمینان کی سانس لی۔

لیکن یہ سکون صرف اپنے بچے کے خطرے سے باہر آنے کا تھا۔

دوسرے بچے کی خیریت کے لیے نہیں۔

وہ وارڈ کے اندر جانے کی اجازت مانگ رہے تھے۔

لیکن ابھی تک ڈاکٹر اس کے لیے رضامند نہیں تھا۔وہ کہہ رہا تھا۔ابھی صرف خطرہ ٹلا ہے۔ بچے کو ڈاکٹری نگرانی کی ضرورت ہے۔ایسے میں کسی کو مریض کے پاس جانے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ابھی بچے کو خون چڑھانے کا کام باقی ہے۔اُس کے بعد ہی.....

دونوں بچوں کے ماں باپ اپنے اپنے لختِ جگر کے لیے پریشانی کے عالم میں وارڈ کے باہر یوں چکر کاٹ رہے تھے، جیسے وہ انگاروں پر چل رہے ہوں۔اُنھیں کسی طور چین نہیں پڑ رہا تھا۔

پتہ نہیں ۔ کتنا وقت اور نکل گیا۔ لمحے، سال یا کون جانے صدیاں۔

اتنے میں تیز قدم چلتی ہوئی ایک نرس دونوں ماں باپ کے پاس آئی جو اُس وقت وارڈ کے دروازے سے یوں چپک کر کھڑے تھے، جیسے وہ اپنے بچے کے پلنگ کے ساتھ کھڑا ہونا چاہتے تھے۔

نرس نے نام لے کر پوچھا۔ ''آپ میں سے ..... کون ہے۔''

''میں ہوں۔'' اُس نے گھبرا کر نرس کی طرف دیکھا۔ میرا بیٹا ٹھیک ہے نہ۔'' اُس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

''آپ میرے ساتھ چلئے۔ ڈاکٹر صاحب بلا رہے ہیں۔

''لگتا ہے میرا بچہ خیریت سے ہے۔'' دوسرے نے اطمینان کی سانس لی۔

''میرا بچہ'' پہلے نے نرس کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے پوچھا۔

نرس تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

وارڈ کے اندر پہنچ کر نرس کے پیچھے آنے والے باپ نے ڈاکٹر کو کھڑکی کے ساتھ والے پلنگ پر جھکا ہوا دیکھ کر اطمینان کی سانس لی۔

''میرا بیٹا خیریت سے ہے، اُس نے سوچا۔'' اُس کا پلنگ تو کھڑکی کے بعد والا ہے، دروازے کے پاس۔''

اُس کا اندازہ ٹھیک تھا۔ اس نے پیچھے پلٹ کر اپنی بیوی کو بچے کی خیریت کی خبر دینی چاہی لیکن دروازہ بند ہو چکا تھا۔ اور اُس پر ہرے پردے چڑھا دیے گئے تھے۔

ڈاکٹر نے کہا۔

دیکھیے جناب! اس بچے کے گروپ کا خون ہمارے بلڈ بینک میں نہیں ہے۔ آپ کے خون کا گروپ ''او'' ہے۔ وہ اس بچے کو دیا جا سکتا ہے۔

''میں اور دشمن کے بچے کو خون ..... سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔'' اس نے دل ہی دل میں سوچا۔

''آپ خون دینے کے لیے تیار نہیں؟'' ڈاکٹر نے پوچھا۔

وہ تذبذب میں تھا۔

تبھی اُس کے کانوں میں اپنے بچے کی آواز آئی۔ وہ نرس سے کہہ رہا تھا۔

''میرا دِل گھبرا رہا ہے۔''

''ڈاکٹر میرے بچے کو دیکھیے۔''

''سسٹر اسے ڈِرپ لگا دو۔ ٹھیک ہو جائے گا۔''

وہ اب بھی اُس بچے کی نبض پر ہاتھ رکھے تھا، جس کی حالت زیادہ نازک ہو رہی تھی۔

''ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔'' ڈاکٹر نے پھر باپ کی طرف دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو۔ ''آپ خون دینے کے لیے تیار ہیں یا نہیں؟''

باپ اب بھی اپنے بچے کی طرف دیکھ رہا تھا، جسے نرس نے ڈرپ لگا دیا تھا۔

''کیا سوچا آپ نے۔'' ڈاکٹر نے اس بار زور دے کر پوچھا۔

''باپ اب بھی فکرمند نظر سے کبھی اپنے بچے کی طرف دیکھ رہا تھا تو کبھی ڈرپ کی بوتل کی طرف جس سے قطرہ قطرہ گلوکوز سوئی کی طرف گر رہا تھا۔

تبھی بچے نے نقاہت سے بند ہوتی پلکوں کے نیچے سے باپ کی طرف یوں دیکھا، جیسے کہہ رہا ہو۔ پاپا اس بچے کو بچا لو۔ اِس کی زندگی میں ہی میری بقا ہے۔

''جلدی فیصلہ کیجیے جناب۔'' ڈاکٹر اُٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

باپ نے اَن منے سے خون دینے کے لیے حامی بھرتے ہوئے اپنے بچے کی طرف دیکھا۔

گلوکوز کے بدن میں تحلیل ہوتے ہی اُس کے چہرے پر راحت کی لہر دوڑ گئی تھی۔

○○○

سون چڑی

جب دھرتی رات کے اندھیرے کی چادر تان کر سوگئی تو آسمان جاگ اُٹھا۔ ستاروں نے انگڑائی لی اور ٹمٹمانے لگے۔

دنیا کے تمام بشر جس طرح صبح ہوتے ہی تازہ دم ہوکر اپنے اپنے کام دھندے میں لگ جاتے ہیں۔ اسی طرح ستارے پوری چمک دمک کے ساتھ زندگی کے سفر پر نکل پڑے۔ کوئی چاند کے گرد طواف جاری رکھے تھا تو کوئی ایک دوسرے کے گرد گھوم رہا تھا۔

یہ سب کرتے ہوئے اُن کی ایک دوسرے سے علیک سلیک بھی ہوئی۔

روشنیوں کا ادان پردان اس طرح ہوا جس طرح ہم اور آپ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہیں۔ ایسا کرتے ہوئے جیسے جیسے اُن کی روشنی پورے جوبن پر آرہی تھی، ویسے وہ ایک دوسرے کی حوصلہ افزائی بھی کررہے تھے۔

''ہاں بھئی۔ زندگی میں جب اندھیرا بڑھ جائے تو سب کے لیے یہ لازمی ہو جاتا ہے کہ ہم اپنے اندر اتنی روشنی پیدا کریں کہ وہ ہماری رہنمائی تو کرے ہی، اور اگر ضرورت پڑے تو اسے ہم دوسروں میں بھی بانٹ سکیں۔ زندگی کی بقا کا یہی تقاضہ ہے۔''

ایسا کہتے ہوئے وہ اپنی چمک کو اور دوبالا کرنے کی کوشش کررہے تھے تاکہ اُن کی روشنی کی شعاعیں فضاؤں کو چیر کر اندھیرے میں ڈوبی دھرتی پر پہنچ سکیں۔ تبھی چاند اپنے تخت پر بیٹھا پوری آب وتاب کے ساتھ رونما ہوا اور دھرتی کے گرد اپنا سفر جاری رکھتے ہوئے اُس نے سب سے پہلے ستاروں کی کہکشاں کی طرف اس طرح نظر دوڑائی جیسے گڈریا کسی اونچی چٹان یا پیڑ کی شاخ پر بیٹھ کر اپنے ریوڑ کی نگرانی کرتا ہے۔

سب کو اپنے اپنے معمول کے مطابق اپنی اپنی راہ پر گامزن دیکھ کر اُس کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی تو ہیروں اور پنّوں سے دمکتی اپنی چوکی پر بیٹھی نانی نے چاند کے گرد پھیلے نور کے ہالے سے روشنی کا ''پھاہا'' لے کر اُسے کاتنا شروع کیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ ہوا کہ وہ روشنی چاندنی میں ڈھل کر اندھیرے سے ڈھکی زمین پر پسرنے لگی۔

نانی کا چرخا جتنی تیزی سے گھوں گھوں کرتا گھوم رہا تھا، اُسی تیزی سے دھرتی پر پھیلنے والی چاندنی اُجلی اور اُجلی ہوتی جارہی تھی۔

اس اُجلی اُجلی چاندنی سے دھرتی جتنی سندر ہوتی جارہی تھی، نانی اُسے دیکھ کر اتنی ہی خوش ہورہی تھی۔ اُسے لگتا تھا جیسے اُس کی کاتی ہوئی چاندنی کے سوت سے اُس کے سامنے رکھی فضا کی ٹوکری بھرتی جارہی ہو۔

جب یہ ٹوکری چاندنی سے پوری طرح بھر گئی تو جیسے پہاڑ کی چوٹی سے آبشار کے گرنے پر پانی کے ننھے ننھے قطرے ہر طرف ماحول میں لطیف سی ٹھنڈک بکھیر دیتے ہیں، ٹھیک اسی طرح ایک سندرتا کی کوکھ سے دوسری سندرتا نئے نئے روپ دھار کر جنم لینے کو مچل اُٹھی۔ بس پھر کیا تھا۔ دھرتی پر چاندنی کا لمس پا کر کلیوں نے اپنے مُنھ کھولے اور پھول بن کر کھل اُٹھے، پھول کھلے تو خوشبو اُن کی ''بکل'' سے باہر آ کر ہوا کے دوش پر سوار ہو کر چار سو پھیلنے لگی۔'' اور جب یہ خوشبو رات کے اندھیروں کو چیرتی ہوئی دھرتی کے نشیب و فراز کو سب سے نیچی وادی کو اور سب سے اونچی گھاٹی کو یکساں طور پر مہکاتی چلی گئی تو چرخا کاتتی نانی سوچنے لگی کہ اگر قدرت کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے، خوشیوں کی خوشبو ہر اُونچ نیچ کو مٹا کر دھرتی کے ہر فرد تک پہنچ سکے تو زندگی کتنی خوبصورت ہو جائے گی۔ خوشیوں کی آبشار سے بھیگتی ساری زندگی۔ اِس تصور سے ہی نانی کا سارا وجود خوشی سے بھیگ بھیگ گیا۔

'' پھر میں سُناؤں گی اس کی کہانی۔ خوشیوں میں بھیگی زندگی کی سندر سی کہانی۔ آہا! کتنا مزا آئے گا۔ کتنی سندر ہوگی وہ کہانی!

نانی ایک پل رُک کر اس کہانی کے لیے کوئی خوبصورت سی تشبیہ ڈھونڈنے لگی۔

''اوں ہوں..... اُوں ہوں۔''

''ہاں! سون چڑی جیسی سونے کے پنکھوں والی سون چڑی۔ دھوپ اور چاندنی کی کرنیں جب اُس سون چڑی کے پنکھوں پر بکھریں گی تو لاکھوں کروڑوں رنگوں کی کہکشاں دھرتی پر پھیل جائے گی۔ واہ! کیا نظارہ ہوگا۔ ایک کہکشاں آسمان پر اور دوسری دھرتی پر۔ اور ان دونوں کہکشاؤں کے بیچ اُڑتی ہوئی سون چڑی کی کہانی۔

سنہرے مستقبل کے سپنے دیکھتی نانی، اُس کی جھلک دیکھتی، خود تصویر بنی ہوئی تھی۔ تبھی اُس کے کان میں کوئی کہہ رہا تھا۔

''چرخا کاتنے والی نانی
ہمیں سناؤ کوئی کہانی۔''

یہ ایک ستارہ تھا، جو نانی کے پاس سے گزرتے ہوئے اُس سے کہہ رہا تھا۔ کہانی کا نام سُن کر کہکشاں میں پھیلے سارے ستارے ایک آواز ہو کر گنگنا اُٹھے۔

چرخا کاتنے والی نانی
ہمیں سناؤ کوئی کہانی

کہانی تو پہلے ہی نانی کے آس پاس بھنورے کی طرح گھوں گھوں کر رہی تھی۔ چڑیا کی طرح چوں چوں کر رہی تھی۔

نانی نے روشنی کا ایک اور ''پھاہا'' لیا اور اُسے کات کر چاندنی بنانے کے لیے دائیں ہاتھ کی اُنگلی سے چرخے کے پہیے کو گھمایا اور تکلے پر کرن کی لمبی تند کاتنے کے بعد بائیں ہاتھ کو اُوپر سے نیچے کی طرف یوں لائی جیسے کہانی کو اپنے پاس بلا رہی ہو۔ پھر کچھ سوچتی ہوئی بولی:

''اچھا میرے بچو آج میں تمھیں سون چڑی کی کہانی سناتی ہوں۔''
''سون چڑی کیسی ہوتی ہے۔ ہم نے تو کبھی اُس کا نام ہی نہیں سُنا۔''
نانی نے اس بار ہاتھ اُوپر اُٹھایا۔ پھر دھرتی کی طرف دیکھا اور بولی:
''سون چڑی! تم چاند پر آؤ۔ سب کو اپنا روپ دکھلاؤ۔''
''پھر میں تُمری کہوں کہانی

دُلہن سی نت نئی نویلی، لیکن جو ہے بڑی پرانی۔''

ستارے بڑے حیران۔ ایسی کون سی کہانی ہوسکتی ہے جو ہے تو بڑی پرانی، مگر سدا دُلہن سی نئی نویلی لگتی ہے۔

کہانی شروع ہونے سے پہلے ہی اُن کے دِل میں سون چڑی کو دیکھنے کی چاہت بڑھ گئی۔

نانی اسی بات کا تو انتظار کر رہی تھی کہ ستاروں کے دل میں کہانی سننے کی خواہش پوری طرح جاگ جائے۔ وہ اپنا گلا صاف کرنے کے لیے ذرا سا کھانسی، چاروں طرف یوں نظر گھمائی جیسے سب کی توجہ اپنی طرف کھینچ رہی ہو۔

لیکن نانی کو لگا جیسے ابھی کہیں ایک آنچ کی کمی ہو۔ اِس لیے اُس نے روشنی کا ایک بڑا سا ''پھاہا'' لیا اور تکلے پر ''تند'' کھینچتے ہوئے اُس کی طرف دھیان سے یہ دیکھتی رہی کہ وہ ہر لحاظ سے ٹھیک ہے یا نہیں۔ ایک جگہ تند ذرا سی موٹی ہو رہی تھی۔ اُس نے دوسرے ہاتھ کی اُنگلیوں سے ''گھنڈی'' کو مروڑ کر تند کو ٹھیک کیا۔ ستاروں کی نظر میں بظاہر وہ تُند ٹھیک کر رہی تھی، لیکن درحقیقت نانی اپنے ذہن میں کہانی کے سارے تانے کو دُہرا رہی تھی تاکہ کہانی سناتے ہوئے کوئی بات چھوٹنے نہ پائے۔

ایسا کرتے ہوئے نانی کہانی میں اس قدر ڈوب گئی تھی کہ اُسے لگ رہا تھا جیسے وہ کہانی کو جی رہی ہو۔ اس لیے وہ اُسی ماحول میں سانس لے رہی تھی۔ اُسے لگ رہا تھا۔ جیسے سون چڑی آ گئی ہے اور اُس کی آمد سے فضا میں لاکھوں کروڑوں رنگ بکھر گئے ہیں۔ اُس کے پنکھوں کی پھڑ پھڑاہٹ اور چوں چوں کی ملی جلی آوزاروں سے ماحول ایسا مترنّم ہو گیا کہ جیسے کن کن میں سورلہریاں گونج اُٹھی ہوں۔ اِن سورلہریوں کی تال پر پھول جھومنے لگے تو چار سو خوشبو ہی خوشبو بکھر گئی۔ اور نانی کا سارا وجود اِس خوشبو میں نہا گیا۔

پاس بیٹھے ہوئے ستارے نانی کے چہرے پر اِن پل پل بدلتے اثرات کو دیکھ رہے تھے۔ اُس کا چہرہ ہی اور کا اور ہو گیا تھا۔

یہ کیسی سون چڑی ہے، جس کے تخیل میں کھوئی نانی کا چہرہ نور ہی نور بن کر دمک

اُٹھا ہے۔

ستارے ایسی سون چڑی کی کہانی سننے کی جلدی میں تھے۔

تبھی نانی کے ہاتھ والا روئی کا ''پھاہا'' ختم ہو گیا تو اُس نے چرخی کو روک کر ایک نظر ستاروں کی طرف دیکھا۔

سب کے سب سانس روکے نانی کے ہونٹوں کے ہلنے کا انتظار کر رہے تھے۔

تبھی ایک ستارے کو یاد آیا کہ نانی نے سون چڑی کو بلایا تھا۔ وہ تو ابھی آئی نہیں۔ کہانی کیسے شروع ہوگی؟

اِس لیے اُس نے پوچھ لیا۔

''نانی نانی۔ سون چڑی کب آئے گی؟''

اُس کے ایسا پوچھتے ہی باقی ستارے بھی دھرتی کی طرف دیکھنے لگے۔ سون چڑی کو وہیں سے تو آنا تھا۔

''سون چڑی'' نانی کی آواز جیسے بہت دور سے آ رہی تھی۔

''سون چڑی آئی تھی۔''

''آئی تھی تو کہاں گئی؟''

''میرے دل میں اُتر گئی۔''

''دل میں اُتر گئی؟''

ہاں! نہ صرف اُتر گئی۔ بلکہ میرے دل میں روشن مستقبل کے سپنے بھی سمو دیے۔

ستاروں کو یاد آیا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اُنھوں نے نانی کے چہرے کو اور کا اور ہوتے دیکھا تھا۔

''اب میں تمھیں اُس کی کہانی سناؤں گی تو وہ تمھارے دل میں بس جائے گی۔''

''محض کہانی سننے سے وہ ہمارے دل میں کیسے بس جائے گی؟''

''یہ یاد رکھو کہ جب زندگی کے پودے پر پھول کا ایک کن بنتا ہے تو ساری کائنات کھل اُٹھتی ہے۔ ایک خوبصورتی کی کوکھ سے لاکھوں کروڑوں قسم کی خوبصورتیاں جنم لیتی

ہیں اور زندگی کے رگ وریشے میں گھر کرتی چلی جاتی ہیں۔

ہم تو سون چڑی کے سونے کے پنکھوں کی چمک دمک کو دیکھنا چاہتے ہیں اُس کی سُریلی چوں چوں کو اپنے کانوں میں گھولنا چاہتے ہیں۔

کہانی کی سون چڑی آنکھوں سے نہیں دیکھی جاتی۔ اُس کی آمد پر کھلنے والے پھولوں کی مہک کو صرف دل میں ہی محسوس کیا جاتا ہے۔

ایسا سنتے ہی ستاروں کے دل ننھے بچوں کی طرح کہانی سننے کے لیے مچل اُٹھے۔

نانی اسی لمحے کا تو انتظار کر رہی تھی۔

اُس نے گلا صاف کیا۔

''اچھا بچو! اب میں کہانی سناتی ہوں۔ لیکن ایک شرط ہے۔''

''وہ کیا نانی؟''

''ایک بڑے بزرگ حضرت میر کا قول ہے کہ ''موتی کسی کی بات ہے سیپی کسی کا گوش۔ اس کا مطلب ہے کہ کہانی کو اس طرح دھیان سے سُننا، جس طرح سیپی، موتی کو سنبھال کر رکھتی ہے۔''

''ہاں نانی ہم کہانی کو پورے دھیان سے سُنیں گے۔'' سب ستارے بولے۔

تو میں کہانی شروع کرتی ہوں۔

''ایک ہے سون چڑی.....''

○○○

ندی پیاسی ہے

فجر کی نماز کے بعد بوڑھا حاجی غوث گل تھوڑی دیر کے لیے سو گیا تو سپنے میں اُس کی قسمت جاگ گئی۔

وہ کیا دیکھتا ہے کہ عید میلاد النبیؐ کے میٹھے روٹ کا تھال ہوا میں تیرتا ہوا اُس کے گھر کی طرف آ رہا ہے۔

''یا خدا! یہ میں کیا دیکھتا ہوں۔ اِس نعمت کی تو میں نے ایک عمر تک تمنا کی تھی۔ لیکن بستی والوں نے اُسے اِس سے صرف اس لیے محروم رکھا کیونکہ وہ اُن کے قبیلے کا نہیں ہے۔ لیکن آج خدا خود اُس پر مہربان ہو گیا۔ پچھلے سال حج کے بعد شکرانے کی نماز ادا کرتے ہوئے اُس نے مولا سے یہی مانگا تھا۔

مولا نے اُس کی سُن لی۔

اے خدا۔ تیرا لاکھ لاکھ شکر۔ 'تو سب سے بڑا منصف ہے۔' تو نے حقدار تک اُس کا حق پہنچا دیا۔

یہ تو معجزہ ہے۔

معجزہ۔

اور وہ سپنے میں خدا کا شکر ادا کرنے کے لیے سجدے میں جھکا تو اس نے محسوس کیا جیسے روٹ کا تھال اُس کے گھر کے دروازے تک پہنچ گیا ہے۔ اُس کی سوندھی سوندھی خوشبو وہ اپنے نتھنوں میں محسوس کر رہا تھا، اور سوچ رہا تھا کہ اُسے اُٹھ کر جلدی سے دروازہ کھولنا چاہیے۔

تبھی اُس کی بیوی نے اُسے جھنجھوڑ کر جگا دیا۔

وہ ہڑ بڑا کر اُٹھا، تو اُس کی بیوی بولی ''اُٹھو۔ اُٹھو۔ لگتا ہے بستی والے روٹ لے کر ہمارے گھر کی طرف آ رہے ہیں۔ سُنو۔ خدا کی حمد کی آوازیں ہمارے گھر تک پہنچ رہی ہیں''۔

''لگتا تو ایسا ہی ہے'' حاجی غوث گل حمد کی آوازیں سن رہا تھا۔

''تو کیا میرا سپنا حقیقت میں بدل رہا ہے۔''

وہ بُدبُدایا۔

''کیسا سپنا سپنا کر رہے ہو۔ اُٹھو۔ وہ جب دروازے تک پہنچ جائیں گے تب اُٹھو گے۔

حاجی غوث گل جلدی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ ''یا مولا تیرا کرم'' کہتے ہوئے اُس نے باہر کی طرف دیکھا۔

نہیں! ابھی تو ہمارے گھر سے کافی دور ہیں۔

''دور ہیں۔ تو کیا ہوا۔ یہاں تک پہنچنے میں کتنا وقت لگے گا۔ پانچ منٹ۔ رُک رُک کر بھی آئیں تو دس منٹ۔

یہ واقعہ رونما ہو رہا ہے ہندوکش کی پہاڑیوں سے گھری بلوچستان کی ایک چھوٹی سی بستی شیخ واصل ہیں۔ سکھر، سبی ہوتی ہوئی جو ریلوے لائن کوئٹہ جاتی ہے، اُسی پر کوئٹہ سے ایک دو اسٹیشن پہلے ایک برانچ لائن افغانستان کی طرف جاتی ہے۔ اُسی ریلوے لائن پر تین چار اسٹیشن بعد ایک خاموش سا ریلوے اسٹیشن ہے شیخ واصل۔

اسی اسٹیشن کے شمال میں ایک پتلی سی ندی بہتی ہے۔ اس میں پانی اتنا کم ہوتا ہے کہ چھوٹے چھوٹے پتھر بھی آدھے بھیگے ہوتے ہیں، آدھے سوکھے۔

یہی حال کبھی ذرا سا آگے جا کر اس ندی کے کنارے بسی بستی شیخ واصل کا تھا۔ یہاں کے لوگوں کی زندگی بھی ندی کے پتھروں کی طرح ہی آدھی سوکھی، آدھی ہری رہتی تھی۔

ان کی زندگی میں نمایاں فرق پڑا حاجی غوث گل کے اس بستی میں آنے سے۔ حاجی

غوث گل کے اس بستی میں بسنے کی کہانی مجھے شروع سے بتانی پڑے گی۔

تب غوث گل کی عمر اٹھارہ اُنیس سال تھی۔ جس پہاڑی پر شیخ واصل کی بستی ہے، اُس کے جنوب میں دس بارہ پہاڑیوں کے بعد ایک چھوٹا درّہ ہے۔ اس درّے کے دوسری طرف کافی چوڑی وادی ہے۔ اس وادی کے بیچوں بیچ ایک ندی بہتی ہے۔ کافی چوڑی۔ کم سے کم بیس بلّم چوڑی۔ لیکن پانی کا بہاؤ وہی پتلا سا۔ یعنی اس میں بھی چھوٹے چھوٹے پتھر نیچے سے گیلے ہوتے ہیں، اوپر سے اُسی طرح سوکھے۔

اس چوڑی ندی کے پاس بھی ایک بستی ہے شیخ خلیل۔ شیخ خلیل میں رہنے والا قبیلہ کوئی اور ہے، اور شیخ واصل کا کوئی اور۔

ان دونوں قبیلوں کے درمیان صدیوں پرانی رنجش ہے۔ اُن کے الگ الگ قبیلے ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ ان پتلی سی دونوں ندیوں کی وجہ سے جن میں پانی کم ہونے کی وجہ سے اُن کے پاٹ میں پڑے ہوئے چھوٹے چھوٹے پتھر بھی نہیں بھیگتے۔

شیخ خلیل کے قبیلے والوں کا دعویٰ ہے کہ کبھی اُن کی ندی جو شیخ واصل کی ندی سے دس گنا بڑی ہے اُس میں کافی پانی رہتا تھا۔ کافی پانی رہتا تھا تو اُن کی بستی کے انگوروں کو بھرپور پانی ملتا تھا۔ بھرپور پانی ملتا تھا تو وہاں کی زندگی بھی پوری طرح ہری بھری تھی۔

اُس زمانے میں شیخ واصل کے قبیلے والوں کے پاس کوئی ندی نہیں تھی۔ پانی کے دو چھوٹے چھوٹے جھرنے تھے، جس سے بوند بوند پانی رِس کر ایک حوض میں جمع ہوتا رہتا تھا۔ بس اُسی تھوڑے سے پانی سے اُن کی گزر بسر ہوا کرتی تھی۔

پانی کی اس تنگی کی وجہ سے ایک بار شیخ واصل، شیخ خلیل کے پاس گیا اور کہا کہ بھائی ہمارے قبیلے میں شادی کا موقع ہے۔ باہر سے مہمان آئیں گے۔ ظاہر ہے پانی کی قلت ہوگی۔ اگر آپ اپنی ندی سے کہیں کہ ہفتے بھر کے لیے، صرف ہفتے بھر کے لیے ہی اپنی ایک دھار کا بہاؤ ہماری بستی کی طرف کر دے تو ہمیں بڑی آسانی ہوگی۔ اس مدّت کے بعد وہ دھار شکریے کے ساتھ واپس کر دی جائے گی۔

شیخ خلیل مان گیا اور ندی نے اپنے آقا کا کہا مان کر ایک دھار شیخ واصل کی طرف موڑ

دی۔

بس وہ دن اور آج کا دن۔ وہی دھار پتلی سی ندی کی صورت شیخ واصل کو چھوتی ہوئی آج بھی بہتی ہے۔

شیخ خلیل والے کہتے ہیں کہ وعدے کے مطابق ہماری پانی کی دھار واپس لوٹاؤ۔

شیخ واصل والے کہتے ہیں کہ ہم نے تو ندی سے کئی بار کہا ہے کہ واپس جاؤ۔ مگر وہ جاتی نہیں۔ اس میں ہمارا کوئی ہاتھ نہیں۔

شیخ خلیل والوں نے بھی ندی کے بہاؤ کو روکنے کی بہت کوشش کی۔ لیکن اس میں اُن کو کامیابی نہیں ملی۔ وہ جو کسی سقراط نے کہا ہے کہ پانی کا بہاؤ اور خیال کا بہاؤ۔ یہ کسی کے روکے سے نہیں رُکتے۔ جتنا روکو یہ اتنا ہی آگے بڑھتے ہیں۔ بلکہ ایک کی جگہ کئی دھارائیں پھوٹ پڑتی ہیں۔ وہی اِس ندی کے ساتھ ہوا۔ شیخ خلیل والے اس کے بہاؤ کو روکنے کی جتنی کوشش کرتے اتنی دھارائیں اور پھوٹ پڑتیں۔ اور اب تو وہ دھارا باقاعدہ ندی بن چکی ہے۔

اس لیے دونوں بستیوں کے درمیان رنجش ہے کہ ختم ہونے میں ہی نہیں آتی۔ اس رنجش کو طول دے دیا غوث گل کے شیخ واصل میں بس جانے نے۔ غوث گل کے اس گاؤں میں بسنے کا قصہ بھی تھوڑی سی تفصیل چاہتا ہے۔

غوث گل دراصل شیخ خلیل کا رہنے والا ہے۔

ابھی وہ چار پانچ سال کا بچہ ہی تھا کہ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔

اُس کی خوبصورت ماں پر پڑوسی جہاں دار خاں نے ٹھیک اسی طرح قبضہ کر لیا جس طرح اُس کے شوہر کے انگوروں کی باڑی کو دِن دہاڑے اپنی باڑی کے ساتھ ملا لیا تھا۔

ماں نے جب اپنے آپ کو بے سہارا پایا تو غوث گل کو سوتیلے باپ کی تلخ مزاجی سے بچانے کے لیے اپنے بھائی کے پاس چمن بھیج دیا۔

چمن میں رہتے رہتے غوث گل نے انگوروں کی بیلوں کو قلمیں لگانے کا ہُنر کیا سیکھا کہ لوگ اُس کے ہاتھ چومنے لگے۔ جس بھی بیل کو وہ قلم لگا دیتا تھا، اُس کے کھٹے انگوروں میں

مٹھاس بھر جاتی تھی۔

جوان ہونے پر غوث گل نے سوچا کہ اب اُسے اپنی بستی میں جا کر اپنے باپ کی باڑی کے انگوروں کو بھی میٹھا کرنا چاہیے۔

اُس کے آنے کی خبر سوتیلے باپ کو ملی تو اس کے ہاتھ کے طوطے اُڑ گئے۔ نیند حرام ہوگئی۔

غوث گل کے آنے کا مطلب ہے کہ ہڑپ کی ہوئی آدھی باڑی اُس کے ہاتھ سے نکل جائے گی۔ ہوسکتا ہے، ساتھ ہی گھر میں ڈالی ہوئی اُس کی ماں جس کے پیٹ سے اُس کے چار بچے پیدا ہوئے تھے، وہ بھی اپنے پلوٹھی کے بیٹے کے پاس رہنا چاہے۔

بھڑکانے والوں نے اُسے بھڑکایا کہ غوث گل تو اُس کی جائیداد کا بھی حصّے دار بن سکتا ہے۔

اس جھمیلے سے بچنے کی ایک ہی صورت ہے کہ غوث گل گاؤں میں پہنچنے ہی نہ پائے۔

غوث گل کی ماں نے جب یہ دیکھا کہ اُس کا شوہر دونالی بندوق کو صاف کر رہا ہے تو خطرے کو بھانپ کر اُس دُور اندیش نے کسی طرح غوث گل تک یہ پیغام پہنچا دیا کہ وہ اپنی بستی میں لوٹنے کی بات ذہن سے نکال دے۔

مرتا کیا نہ کرتا۔ غوث گل چمن کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ چکا تھا۔ اپنی بستی میں سوتیلا باپ ہی اُس کی جان کا دشمن ہو رہا تھا۔

وہ جائے تو کہاں جائے۔

اِس طرح وہ شیخ واصل میں پناہ لینے پر مجبور ہو گیا۔

شیخ واصل والوں نے اُسے پناہ دی بھی اور نہیں بھی۔

اُسے اپنا بنایا بھی لیکن نہیں بھی بنایا۔

اوّل تو شیخ واصل کے بڑے بوڑھے پناہ دینے کے حق میں ہی نہیں تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ اِس سے دونوں بستیوں کے درمیان جھگڑے بڑھیں گے۔ ندی کا بکھیڑا ہی صدیوں سے سلجھ نہیں پایا تو اِس نئے جھگڑے کو کون مول لے..... پھر یہ کہ وہ لوگ تو غوث گل کو ہی

ختم کرنے کے فراق میں ہیں تو اُس کو پناہ دینے والوں کو تو ظاہر ہے وہ اپنا دشمن سمجھیں گے ہی۔

اسی بات کو وہ دوسری طرح سوچتے تو کہتے کہ پہلے اُنھوں نے ہمارا کیا بگاڑ لیا ہے جو اب کچھ کرلیں گے۔ غوث گل ہُنر مند آدمی ہے۔ اس کی مدد سے اگر ہماری بستی کے انگور میٹھے ہو جاتے ہیں تو اس میں بستی کی بھلائی ہے۔

اس لیے اسے پناہ دینے میں کوئی حرج نہیں۔

کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا بھی پڑتا ہے۔

آخر اُنھوں نے اُسے اپنے ہاں اس طرح رکھا جیسے اُن کی بستی میں ہے بھی اور نہیں بھی۔

زیادہ تر بلوچی بستیوں کی طرح شیخ واصل کی بستی بھی ایک پہاڑ کی ڈھلان پر بسی ہے۔ اُسی بستی سے قریب سو بلم کی دوری پر ایک جگہ ایک چٹان اس طرح آگے بڑھ گئی ہے جیسے وہ نیچے بہتی ہوئی پتلی سی ندی پر سایہ کر رہی ہو۔ بستی والوں نے غوث گل کو اسی چٹان پر اپنا ڈیرا جمانے کی اجازت دے دی۔

غوث گل نے پہلے تو بڑے بڑے پتھر ایک دوسرے کے اوپر رکھ کر ندی کی طرف نصف دائرے کی شکل میں پانچ چھ فٹ اونچی دیوار کھڑی کر لی۔ دائیں طرف سے ایک اونچی سی چٹان خدائی طور پر بستی کی طرف سے آڑ کر رہی تھی۔ بس دائیں طرف اُس نے پتھر جوڑ کر دیوار کھڑی کی تو اخروٹ کی ٹہنیوں کی چھت ڈال دینے سے اچھا خاصا ڈھابا تیار ہو گیا۔

غوث گل کے لیے سر چھپانے کا سہارا ہو گیا۔

یہ چھوٹا سا گھر شیخ واصل کی بستی سے اس حد تک کٹا ہوا تھا کہ ضرورت بھر پانی لانے کے لیے بستی کی طرف جانے کے بجائے غوث گل نے ندی تک پہنچنے کے لیے ایک الگ راستہ بنا لیا۔ بس دو تین جگہ اُسے چٹان کی تھوڑی تراش خراش کرنی پڑی تھی اور بس۔

اس گھر میں رہتے ہوئے اُس نے بستی والوں کی انگوروں کی بیلوں کو قلمیں لگانی

شروع کیں تو دو تین سالوں میں ہی اُس کی ہنر مندی اور محنت نے وہاں کے کھٹے انگوروں میں مٹھاس بھر دی۔ بس فرق صرف یہ پڑا کہ پہلے اُن کے انگور لمبے لمبے ہوتے تھے، انگلی کی پور کی طرح پتلے اور لمبے، اور اب وہ ناخن کے ناپ کے چھوٹے چھوٹے ہو گئے تھے۔ چھوٹے مگر رسیلے اور اتنے میٹھے کہ وہاں کے لوگوں نے اُن انگوروں کی کشمش بنا کر کوئٹے کی منڈی میں بھیجنا شروع کی، تو اُس کی مٹھاس کی خوشبو شیخ واصل کے چھوٹے سے ریلوے اسٹیشن کی پہچان بن گئی..... ریل کے اسٹیشن کی حد میں داخل ہونے سے پہلے ہی یہ خوشبو ان کو بتا دیتی کہ شیخ واصل کا اسٹیشن آ گیا ہے۔

شیخ واصل کی کشمش کی یہی خوشبو، شیخ خلیل کے قبیلے والوں کے دلوں میں کانٹا بن کر گڑنے لگی۔

اُن کے قبیلے کا چشم و چراغ اور اُس نے دشمن قبیلے کے انگوروں کو میٹھا کر دیا۔ قبیلے والے اندر ہی اندر اُس کے سوتیلے باپ کو ذمے دار ٹھہرانے لگے، جس کے ڈر کی وجہ سے وہ وہاں جا کر بس گیا تھا۔

یہ اور بات ہے کہ کھل کر بات کرنے کی ہمت کسی کی نہیں تھی، کیونکہ سوتیلا باپ یعنی جہاں دار خاں قبیلے کا سردار تھا اور اُس کے خلاف آواز اُٹھانا کسی بھیڑے کو آواز دینے جیسا تھا۔

اُنھیں اس بات کا علم ہو چکا تھا کہ غوث گل کی ماں، جواب جہاں دار خاں کی شریکِ حیات ہے، اور جس نے اُس کے لیے چار شیروں جیسے بیٹے پیدا کیے ہیں، اُس نے جب دبے لفظوں میں اپنے پلوٹھی کے بیٹے کے حق میں کچھ کہا تو جہاں دار خاں نے اُسے طلاق دے کر دوسرے ہی پل بیگم سے گھر کی لونڈی بنا کر رکھ دیا۔

کبھی بڑی بیگم رہ چکی زیبا خاتون اب اپنے سے آدھی عمر کی دوسری بیگموں کی غلامی کرنے میں ہی اپنی عافیت سمجھتی ہے۔

ان حالات میں غوث گل کی شادی کی فکر کون کرتا۔

سگی ماں نئی لونڈی بنی سوتیلے باپ کی سختیاں سہہ رہی تھی۔ ایسے میں اس کے اپنے

قبیلے سے اُسے اپنی لڑکی کون دیتا۔ سننے میں آیا تھا کہ ایک بیوہ عورت کو اُس کی ماں نے اِس کارِ نیک کے لیے تھوڑا بہت رضامند بھی کرلیا تھا، لیکن زیبا خاتون کے برے دن آتے دیکھ کر اُس نے بھی اِس بات کو دل سے اِس طرح نکال دیا جس طرح سانس چھوڑنے کے بعد آدمی بھول جاتا ہے کہ ہوا کا یہی ٹکڑا کبھی اُس کے جسم کے اندر زندگی کی رو بن کر دوڑا تھا۔

وہ تو غوث گل کی قسمت اچھی تھی کہ اُس کے چمن والے ماموں کی ایک لڑکی جس کی ایک آنکھ بچپن میں ہی چوٹ لگ جانے سے ناکارہ ہوگئی تھی، اُس سے جب کوئی دوسرا بلوچ شادی کرنے کے لیے تیار نہ ہوا تو اُس نے پرانے احسان کا حساب برابر کرلیا۔ چار روز کے لیے غوث گل کو چمن بلوایا، قبول کے دو بول پڑھوائے اور اِس طرح وہ اپنی ذِمے داری سے بھی سبکدوش ہوگیا اور غوث گل پر ایک نیا احسان بھی کردیا۔

اِس بیوی کے ساتھ رہتے ہوئے غوث گل نے اپنی عمر شیخ واصل میں گزار دی۔ انگوروں کے پودوں کی قلمیں لگاتے سردے کی بیلوں میں اپنی محنت کی مٹھاس بھرتے اب تو وہ اپنی عمر کے 80ویں پیٹے میں پہنچ گیا تھا۔

اولاد نہیں ہوئی تو۔ اس کو بھی اُس نے خدا کی نعمت ہی سمجھا۔ اتنی خدمت اور خلوص کے باوجود شیخ واصل والے آج بھی مجھے پناہ گزیں ہی سمجھتے ہیں۔ میں نے تو اِس دُکھ کو بھوگ لیا۔ ہر دم دل و جاں میں کانٹے کی طرح چبھنے والا احساس میری اولاد تک منتقل نہیں ہوا۔ یہی اچھا ہے۔ اللہ کا بڑا کرم ہے۔ وہ جو کرتا ہے بہتر ہی کرتا ہے۔

غوث گل یوں تو کانٹے کی اِس چبھن کو دِن رات کام میں لگے رہنے کی وجہ سے بھولا رہتا تھا لیکن پھر بھی سال میں ایک رات ایسی آتی تھی جب سارا شیخ واصل، عید ملادالنبیؐ کا جشن مناتا ہوا ساری رات ذکرِ نبیؐ میں مشغول رہتا۔

اُس رات غوث گل کے سینے میں دبا ہوا یہ درد ناسور کی طرح جاگ جاتا تھا۔

لیکن جشن! کیا جشن ہوتا تھا۔ شیخ واصل کی بستی میں ہر طرف مشعلوں سے چراغاں کیا جاتا تو ایسا لگتا کہ خدا کا نور، روشنی بن کر شیخ واصل پر برس رہا ہو۔

لا الٰہ الا اللہ، لا الٰہ الا اللہ کا ورد کرتی بستی کی کنواریاں قطاروں میں گڑھی ان شعلوں کو

جب روشن کرتیں تو ایسا لگتا کہ آئیتوں کے حروف نگینوں کی طرح جگمگا اٹھے ہوں۔

مشعلیں جلانے کا کام جیسے ہی ختم ہوتا تو بڑے بڑے الاؤ روشن ہو جاتے اُن میں سے دو پر دو دو بکرے لپٹوں میں بھننے لگتے۔ تھوڑی ہی دیر میں اُن میں بھرے ہوئے مسالوں کی خوشبو سے ماحول مہک اُٹھتا۔ دو الاؤ پر بڑی سی دیگچیوں میں بریانی اور میٹھے چاول پکنے لگتے۔

اُن کے بعد والے الاؤ کا ذِکر کرتے ہی میٹھے روٹوں کی لذت راقم الحروف کے مُنہ میں بھر گئی ہے۔

دودھ میں گندھے آٹے میں کیا کیا میوے پڑتے تھے۔ کشمش، بادام، اخروٹ، سردے اور تربوز کے بیج، خوشبو کے لیے کیسر اور دیسی گلاب کی پتیاں۔

یہ روٹ بڑے بڑے ہوتے تھے۔ بہت بڑے۔ اتنے بڑے کہ ساری بستی کے لیے تین چار ہی کافی ہوتے۔

گاؤں کی عورتیں آٹے کو ایک بڑی سی چٹان پر پھیلا کر گھنٹوں گوندھتی رہتیں۔ گوندھتی اور اِس میں میووں کی ٹوکریاں بھر بھر کر ڈالتی رہتیں۔

الاؤ کے نیچے کی چٹان جب تپ کر لال ہو جاتی تو لکڑیوں اور کوئلوں کو ایک طرف ہٹا کر اُس پر تھوڑا پانی چھڑکا جاتا۔ بوڑھی عورتوں کو چٹان کے سُوں سُوں کرنے سے ہی اُس کی تپش کا اندازہ ہو جاتا۔ جب وہ یہ دیکھتیں کہ ہاں چٹان ٹھیک سے تندور کی طرح تپ گئی ہے تو پھر انگور کی تازہ پتیاں بچھا کر اُس پر روٹ کے لیے تیار کیا گیا آٹا پھیلا دیا جاتا۔ پھر روٹ کی اوپری سطح پر بھی انگوروں کی پتیاں ڈال کر روٹ کے اوپر گرم گرم بھوبل (راکھ) کی موٹی تہہ بچھا دی جاتی۔

اس گرم گرم بھوبل میں بھری چنگاریاں ہوا میں چمکتیں تو الاؤ کے گرد ناچنے والے شیخ واصل کے لوگوں کی بھوک بھی چمک جاتی۔

آخری الاؤ پر تبرک کے لیے جو روٹ تیار کیا جاتا ہے، اُس کی تو بات ہی نرالی ہے۔ آٹے میں زیادہ میوے ڈالے جاتے۔ اِس الاؤ کے گرد بیٹھی عورتیں لا الٰہ الا اللہ، محمد رسول

اللہ کا متواتر ورد کرتی رہتی ہیں اور ضرورت کے مطابق اُس کے اوپر اور بھوبل بھی ڈالتی جاتی ہیں۔ اِس کی پاکیزگی اور مٹھاس بڑھ جاتی ہے، سواد سوا ہو جاتا ہے۔

اس کی خوشبو کو اپنی سانسوں میں، اپنے جسم کے رگ وریشے میں دوڑتے ہوئے محسوس کر کے شیخ واصل والوں کے دلوں میں عقیدت کی لو جگمگانے لگتی ہے۔

الاؤ میں آگ کی بل کھاتی لپٹوں کی دھاریاں، بھوبل کے اندر چمکتی ہوئی چنگاریاں، گوشت اور روٹ کی مہک، اور اللہ کے نام کے وِرد کی مہک، اِن سب کے ملے جلے اثر سے ماحول میں ایسا وجد سا چھا جاتا ہے کہ بلوچوں کے پاؤں تھرکنے لگتے ہیں۔ ڈف جیسے خود بخود بجنے لگتے ہیں، الگوزوں کی دُھنیں جاگ کر فضا میں تیرنے لگتی ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ شیخ واصل کے بشر، شجر، ہوا، فضا، پاس بہتی 'ہوئی ندی' سب کے سب ناچ اُٹھے ہوں اور جب یہ ناچ اپنے عروج پر پہنچتا ہے، تو ایسے لگتا ہے کہ جیسے شیخ واصل ہی نہیں اُس کے اِردگرد کے پہاڑ بلکہ پورا بلوچستان وہاں سمٹ کر ناچ رہا ہو۔

ناچ رہا ہو اور اپنے حصّے کا تبرک مانگ رہا ہو۔

اس ناچ کے مدھم پڑتے ہی عورتیں ایک دائرے میں گھومتی ہوئی بازو الارالار کر گاتی کل عالم کو کھانے میں شریک ہونے کی دعوت دیتی ہیں۔

آئے سارا عالم آئے۔
شیخ واصل میں کھانا کھائے۔

عورتوں کے اس گیت کی صدا کوندی اپنی لہروں میں بھر کر تیز تیز بہنے لگتی ہے۔ ہوا ان بولوں کو اپنی آغوش میں بھر کر سب سے پہلے تو شیخ خلیل کے باسیوں کو کہتی ہے کہ شیخ واصل کے لوگ بڑے خلوص سے آپ کو کھانے کی دعوت دے رہے ہیں۔ تمام اختلافات کو بھلا کر جاؤ اور اُن کے ساتھ گلے مل کر تیوہار کی خوشیاں مناؤ۔ اُس کے بعد یہی ہوا بلوچستان کی حدوں کو پار کر کے خطۂ ارض پر بسے تمام لوگوں کے کان میں گیت کے بولوں کو دُہراتی ہے:

آئے سارا عالم آئے۔
شیخ واصل میں کھانا کھائے۔

لیکن ہائے ری قسمت۔ اس ندی اور ہوا کی لہروں کے راستے میں، نسلی، مذہبی، قومی اور پتہ نہیں اس طرح کے اور کتنے ہی اُونچے اُونچے پہاڑ پڑتے ہیں جو شیخ واصل کی بستی میں گونجنے والے ان خلوص بھرے بولوں کو آگے نہیں بڑھنے دیتے۔ یہ صدائیں ان پہاڑوں کی سنگلاخ چٹانوں سے ٹکراتی ہیں اور شیخ واصل کی بستی میں لوٹ آتی ہیں۔

اور تو اور یہ پہاڑ کسی نہ کسی شکل میں شیخ واصل کے قبیلے والوں اور غوث گل کے درمیان بھی حائل ہے۔

غوث گل جشن کے ان موقعوں پر شامل تو ہوتا ہے لیکن اُس کی شمولیت غیر کی بارات میں اجنبی باراتی کی سی ہوتی ہے۔ بلکہ اُس سے بھی گئی گزری، کیونکہ سب لوگ اُسے جانتے تو ہیں مگر ایسے جیسے نہیں جانتے ہوں۔

وہ سب کے ساتھ مل کر جشن کی تیاریوں کے لیے سارے کام کرتا ہے۔ ہنستا ہے، خوش ہوتا ہے۔

لیکن غوث گل کو لگتا ہے جیسے وہ اپنے لیے نہیں خوش ہوا، بلکہ غیروں کی خوشی میں خوش ہو رہا ہے۔ وہ ہنس رہے ہیں، اِس لیے وہ ہنس رہا ہے، وہ ناچ رہے ہیں، اِس لیے وہ ناچ رہا ہے۔

اسی لیے آدھی رات جب پیٹ کی بھوک کے پوری طرح جاگ جانے پر، کھانے کا وقت ہوتا ہے تو ہر ایک اپنا حق سمجھ کر الاؤ پر پکے ہوئے روٹ اور بھنے ہوئے گوشت کے ٹکڑوں کو توڑتا ہے۔

غوث گل بھی کھاتا تو پیٹ بھر کا ہے۔ لیکن ایسے جیسے اُس کی حیثیت اپنے ہی گھر میں مہمان جیسی ہو۔

اُس کے کھانا لینے میں حق نہیں جھجک ہوتی ہے۔

ایسے ہی موقعوں پر اُسے احساس ہوتا ہے کہ وہ اپنوں کے بیچ نہیں ہے۔ کبھی کبھی تو اُس کا دل کرتا ہے۔

''چھوڑ جائے یہ نگری چلا جائے اپنوں کے بیچ'' لیکن کیا اب وہ اُسے اپنا بنانے کے

لیے تیار ہوں گے۔ کبھی نہیں۔ غیروں کے ساتھ رہنے والا اُن کے لیے کب کا غیر ہو چکا۔

اُس نے تو ایک بار کوشش کی تھی۔

ماں کے جنازے کی نماز میں شریک ہونے کے لیے گیا تو اپنے لوگوں کی تیکھی نظروں کو برداشت کرنا، اُس کے لیے برداشت سے باہر ہو گیا تھا۔

ماں کی قبر پر خاک کی مٹھی ڈالتے وقت اُس نے اپنے واپس لوٹنے کی خواہش کو بھی وہیں دفن کر دیا تھا۔

کسی سے ہمدردی کے دو بول سنے بغیر۔

شیخ خلیل کو لوٹنے کی خواہش کو ماں کی قبر میں ہی دفن کرنے کے بعد اُس کا خیال تھا کہ وہ اپنی زندگی کی تمام خواہشوں کو بھی وہیں دفن کر آیا ہے۔

لیکن ایسا ہو نہیں پایا تھا۔

چھوٹی ندی کو پار کرنے کے بعد جب وہ شیخ واصل کی پہاڑی چڑھ رہا تھا تو اُس کی ایک پرانی خواہش پھر جاگ اُٹھی تھی۔

یہی کہ شیخ واصل والے اُسے اپنا بنا لیں۔

اس کا اشارہ اُسے تبھی ملے گا جب عید میلاد النبیؐ کے تبرک کے روٹ کا تھال لے کر قبیلے والے اُس کے گھر آئیں گے۔

جب سے وہ اس بستی میں آیا ہے، یہ روٹ کئی کئی بار کئی لوگوں کے گھر جا چکا ہے۔ ایک نہیں پہنچا تو اُس کے گھر تک۔

سوتے جاگتے ہوئے یہ خواہش اُس کے دل میں مچلتی رہتی ہے کہ یہ روٹ اُس کے گھر تک پہنچے اور پھر سب کے آگے چلتا ہوا وہ اس روٹ کو بستی کے بچے بچے میں تقسیم کرے۔ پھر شیخ واصل کے ریلوے اسٹیشن پر جا کر ریل کے مسافروں میں تبرک بانٹے۔

لوگ آگے بڑھ کر اُس کا ہاتھ چومیں۔

کتنا اہم ہے یہ مرتبہ۔

عزت، احترام۔

ثواب۔

جب سے وہ حج کر آیا ہے، تب سے وہ اپنے آپ کو اس عزت کے لیے زیادہ حقدار سمجھتا ہے۔

آج اُس کا یہ سپنا سچ ہونے جا رہا ہے۔

اُس نے خواب میں یہی دیکھا تھا۔

اب اُس کی بیوی نے بھی اُسے یہی مژدہ سنایا ہے۔

بستی والوں کی حمد گانے کی آوازیں اُس کے گھر کے قریب ہوتی جا رہی ہیں۔

اے خدا۔ تیرا شکریہ۔

خدا کے رسولؐ نے میری دُعا سُن لی۔

شکرانے کے طور پر وہ سجدے میں جھک گیا۔

آخر بستی والوں نے مجھے اپنا بنا لیا ہے۔

میاں بیوی اُٹھ کر گھر کی چوکھٹ تک آ گئے۔

گھر کے سامنے کھلے آنگن میں انگور کی چار پانچ ٹہنیاں سوکھنے کے لیے رکھی ہوئی تھیں۔ اُنھیں جلدی سے اُٹھا کر ایک کنارے پر رکھ دیا، تا کہ سب کے کھڑے ہونے کے لیے جگہ ہو جائے۔

چار دیواری کے پاس دو پتھر بھی گرے ہوئے تھے۔ اُنھیں بھی اُٹھا کر دیوار پر رکھ دیا گیا۔ اور خوش آمدید، خوش آمدید کہتے ہوئے غوث گل اور اُس کی بیوی نے بستی والوں کی تعظیم میں بانہیں پھیلا دیں۔

خوش آمدید۔

خوش آمدید۔

دونوں نے اُنھیں آگے آنے کے لیے کہا۔

لیکن یہ کیا؟

یہ لوگ رُک کیوں گئے؟

شاید وہ لوگ چاہتے ہیں کہ تبرک کا تھال ہم اپنے سر پر اُٹھا کر گھر میں داخل ہوں۔
وہ خوش خوش آگے بڑھے۔
اُنھوں نے تبرک کا تھال حاجی غوث کے سر پر رکھ دیا۔
وہ مُڑ کر اپنے گھر کی طرف قدم بڑھانے ہی والا تھا۔
تبھی اُس کے کانوں میں قبیلے کے سردار کی آواز آئی۔
''ہم نے سوچا۔ کریم گل حج کر کے آیا ہے، اس لیے کوئی حاجی ہی تبرک کا تھال اُس کے گھر تک پہنچائے''۔
بستی والوں میں گھرا ہوا غوث گل، سر پر تبرک کا تھال اُٹھائے، اپنے قدموں سے نہیں، بستی والوں کے قدموں پر چلتا ہوا کریم گل کے گھر کی طرف بڑھ رہا ہے۔

○○○

اپنی کہانی

میں اس دنیا میں کب پیدا ہوا تھا۔ اس کا ٹھیک ٹھیک پتہ لگانا تو مشکل کام ہے، لیکن میرے اندر کہانی کار کب پیدا ہوا تھا، اس کا تھوڑا بہت اندازہ ہے مجھے۔

جہاں تک میرے پیدا ہونے کا تعلق ہے تو صرف اتنا ہی پتہ ہے کہ وہ سردیوں کا موسم تھا۔ رہی وقت اور تاریخ یا سن کی بات، تو صرف اتنا ہی بتا سکتا ہوں کہ تین ساڑھے تین سال کا تھا، جب مولوی امام دین مجھے میرے گھر کی ڈیوڑھی سے گود میں اُٹھا کر اس اسکول میں لے گئے تھے، جو ایک مسجد کے سامنے ایک شیشم کے پیڑ کے نیچے لگتا تھا۔ ظاہر ہے کہ انھوں نے اپنے رجسٹروں میں میری عمر پانچ سال لکھ دی ہوگی، جو اصل عمر سے ڈیڑھ دو سال زیادہ ہی ہوگی۔ ان کا لکھا ہوا یوم پیدائش ۱۵ر نومبر ۱۹۲۷ء ہے۔

رہی کہانی کار کے پیدا ہونے کی بات، تو مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ گرمیوں کی ایک رات کو میری چھوٹی دادی نے، جو روز رات کو ''بات'' سنایا کرتی تھیں، سب بچوں سے پوچھا تھا کہ اس کے مرنے کے بعد ہم اسے کس بات کے لیے یاد رکھا کریں گے؟

اور بچوں نے کیا کہا، مجھے پتہ نہیں۔ مجھے اپنا جواب یاد ہے، میں نے کہا تھا: ''اس لیے کہ تم ہر رات کو ہمیں 'بات' سنایا کرتی ہو۔''

آج جب میرا دھیان اپنی اس بات کی طرف جاتا ہے تو خیال آتا ہے کہ دادی ماں کی کہانیاں سنتے سنتے میرے ذہن کی دھرتی میں میرے دل کی وادی میں کہانی کار کا بیج بھی پنپنا شروع ہو گیا تھا۔

یوں میں بچپن ہی سے بہت حساس واقع ہوا ہوں، جو کہانی کار کا بنیادی گن ہے۔

میرے دوسرے بہن بھائی میرے والدین کے ساتھ لاہور اور بعد میں کوئٹہ بلوچستان میں رہتے تھے اور مجھے گاؤں میں دادی کے پاس چھوڑ دیا گیا تھا۔ دادی بھی وہ جو بہت سخت مزاج تھیں اور بات بات پر طوم کر رکھ دیتی تھیں۔ ایسی دادی کے سخت مزاج کو جھیلتے جھیلتے میرے نرم و نازک دل میں یہ خیال پوری طرح گھر کر گیا تھا کہ میں اپنے والدین کا اصلی بچہ نہیں ہوں۔ کہیں سے گرا پڑا ان کے ہاتھ لگ گیا ہوں، اس لیے انہوں نے مجھے اپنے ساتھ رکھنے کے بجائے دادی ماں کے پاس رکھ چھوڑا ہے۔ اس خیال کو تقویت پہنچانے کے لیے میں نے اپنے شک و شبہات کی بنا پر نہ جانے کتنی کہانیاں گھڑ ڈالی ہوں گی اور من گھڑت اندیشوں کی ضربیں سہتا میرا بچپن خون کے اتنے آنسو بہایا کرتا تھا کہ آنسو ہر وقت میری آنکھوں میں تیرا کرتے تھے۔

کوئی میرے، بچپن کا نام رتی پکار کر کہتا:

''رتی رویا، رتی رویا، رتی رویا، رتی رو پڑا۔''

اور رتی کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھار بہ نکلتی، مجھے لگتا ہے وہ سارے آنسو ننھے سے رتی کی درد بھری کہانیاں تھیں۔

میری پیدائش سے بہت پہلے میرے خاندان میں دوہرا سانحہ ہو گیا تھا۔ کہتے ہیں تب سارا ملک طاعون کی لپیٹ میں آ گیا تھا جب میرے پڑ دادا، میرے چھوٹے دادا کا داہ سنسکار کر کے لوٹے تو بڑے دادا کے مرنے کی تار گھر پر رکھی تھی۔ اس طرح میری دونوں دادیاں جوانی ہی میں بیوہ ہو گئی تھیں۔ میری دادی بڑے دل گردے کی عورت تھی۔ اس نے ساری عمر خود کو بیوہ مانا ہی نہیں۔ وہ تو گھر پر آنے والے پیروں فقیروں سے یہی کہتی تھی کہ۔

''میرا مرد پردیس گیا ہے، بتاؤ کب آئے گا؟''

اپنی دادی کی یہ بات سن کر میں اکثر اپنے دادا کی تلاش میں ذہنی طور پر انجانی وادیوں میں بھٹکتا رہتا تھا۔ رہی میری چھوٹی دادی، تو وہ کبھی اس صدمے کو بھلا نہیں پائی تھی۔ ان کا من اداس ہوتا تو ہیر رانجھا، مرزا صاحباں یا پورن بھگت جیسے قصے لے کر پڑھنا شروع کر دیتیں۔ لیکن دُکھی من کو ڈھارس کہاں ملتی ہے، جب ہیر اور صاحباں کو ہجر کے غم میں، یا

پورن بھگت کی ماں اچھراں کو پورن کے غم میں تڑپتا دیکھتیں تو وہ اپنے غم کو ان کے غم کے ساتھ ہم آہنگ کر کے رونے لگتیں۔ پھر یہ ہوا کہ بڑھاپے میں ان کی نظر کمزور ہوگئی تو جب کبھی ان کا من کرتا، وہ مجھ سے یہ غم کی داستانیں پڑھوا کر سنتی تھیں۔ اس طرح نو دس سال کی عمر میں، میں وارث شاہ، قادر یار، بلھے شاہ، شاہ محمد کے شہہ پاروں سے روشناس ہوگیا۔

محبت اور ایثار بھرے ان شاہکاروں نے میرے دل میں ایک نئی دُنیا آباد کر دی۔ میں تخیل کی دُنیا میں چلتے چلتے وہاں پہونچ جاتا جہاں ہیر دریائے چناب کے کنارے رانجھے کو میٹھی چوری کھلاتی تھی۔ جہاں مرزا صاحباں کو اپنے گھوڑے پر بٹھا کر بھگا رہا ہوتا ہے۔ یا جہاں پورن، بھگت کے حسن کو دیکھ کر رانی سندراں مبہوت ہو کر اس کے کشکول کو ہیرے موتیوں سے بھر دیتی ہے۔ ان قصوں نے میرے دل میں جو چنگاری روشن کی تھی، اس کو ہوادی جھنڈے شاہ کے ڈیرے میں آنے والے مغنیوں اور داستان گو حضرات نے۔ جب کبھی یہ مغنی آتے تو سائیں جھنڈے شاہ کے ڈیرے میں برگد کے نیچے بڑا ٹھٹھ لگتا۔ سارنگی کے درد بھرے سروں کے بیچ اونچی اُٹھتی ہوئی لہک دار آواز میں جب مغنی یہ گاتے کہ رانجھا گاؤں کے چوراہے پر کھڑا ہو کر لوگوں کو پکار رہا ہے کہ اگر کسی کو فقیر ہونا ہے، یا جوگی بال ناتھ کے ٹلے پر جانا ہے تو میرے ساتھ آؤ، تو میں تصور ہی تصور میں رانجھے کے ساتھ ہو لیتا تھا اور جب اچھراں کے غم کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر سارنگی کی گونج برگد کی شاخوں سے ٹکراتی ہوئی اونچی اُٹھتی تو برگد پر بیٹھے پکشیوں کی آنکھیں بھی نم ناک ہو جاتیں اور رتی کا دل بیٹھنے لگتا۔

یہ درد بھرا دل لے کر اور ملک کی تقسیم کا گہرا زخم کھا کر جب ہندوستان آیا تو خوش قسمتی سے میرے قدم لکھنؤ کی سرزمین پر آ ٹکے، جو اس زمانے میں ادب کا بہت بڑا مرکز تھا۔

اب تک میں نے صرف پنجاب کے شاہکار ادب کو پڑھا تھا لیکن کچھ لکھنے کی بات کبھی سوچی بھی نہیں تھی۔ میرے لیے تو چھپا ہوا نام خدا کا نام تھا۔ اس لیے کسی تخلیق کے ساتھ اپنا نام چھپنے کی بات تو میں نے کبھی خواب و خیال میں بھی نہیں سوچی تھی۔ ہاں من میں کچھ کر گزرنے کی تمنا تھی، کچھ بننے کی خواہش تھی، دل میں رانجھے کا سا ولولہ تھا، مرزے کا حوصلہ تھا لیکن جسم اس زخمی پرندے کی طرح تڑپتا تھا جس کے پنکھ حالات نے کاٹ کر رکھ دیئے تھے۔

میں زمین پر تڑپتا ہوا آسمان کو بس دیکھا کرتا تھا پرواز بھرنے کی سکت نہیں تھی۔

پھر ایک دن قدرت مہربان ہوئی۔ میں اپنے بڑے بھائی سردار گوپال سنگھ کے پاس خلیج کچھ گیا ہوا تھا۔ وہاں سمندر کے کنارے بھٹکتے بھٹکتے من نے کچھ گنگنانا چاہا تو جس شخص نے وارث شاہ، قادر یار، شاہ محمد جیسے عظیم شاعروں کے شاہ پارے کئی کئی بار پڑھ رکھے تھے، اسے ان کا ایک بھی مصرعہ یاد نہیں آ رہا تھا۔ دراصل ملک کے تقسیم کی غم کی شدت نے ذہنی کیفیت کچھ ایسی کر دی تھی کہ زندہ رہنا ہے تو سب کچھ بھلاتے چلے جاؤ۔ اس وقت سب کچھ بھلانے کے بعد کچھ گنگنانے کی خواہش کو پورا کرنے کے لیے میں نے پنجابی میں ایک دُعائیہ نظم کہی۔ اس طرح میرے اندر ایک تخلیق کار پیدا ہو گیا۔ ۱۹۵۳ء کے شروع میں میری رام لعل سے ملاقات ہوئی تو مری کچھ نظمیں پنجابی کے رسائل میں چھپ چکی تھی۔ رام لعل صاحب نے کہا کہ اردو میں کہانیاں لکھو۔

''اردو۔ لیکن میری تو اردو کی تعلیم بہت تھوڑی ہے۔ صرف آٹھویں درجے تک۔''

''کہانی میں بول چال کی زبان کی ہی ضرورت پڑتی ہے۔''

پھر رام لعل صاحب مجھے پی ڈبلیو اے کے ایک جلسے میں لے گئے۔ کمال احمد صدیقی کے ہاں ہوئے اس جلسے سے باہر آیا تو مجھے احساس ہوا کہ جیسے مجھے راستہ مل گیا ہے۔

پھر میں نے پہلی کہانی لکھی ''ممی تم ایک دیوار ہو۔'' پھر دوسری ''ہادی''۔ تیسری ''پہلی آواز''۔ اس کے بعد مجھے پیچھے مُڑ کر دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔

مجھے یاد ہے آل احمد سرور صاحب کے گھر جب میں اپنی کہانی ''ہادی'' سنا رہا تھا تو اس وقت جلسے میں بیس پچیس حضرات موجود تھے۔ ہادی ان دونوں زندہ تھے اور لکھنؤ کے کھیلوں کے شائقین ان کے کردار سے پوری طرح واقف تھے۔ میرے کہانی سناتے سناتے کچھ لوگ آپس میں ہادی کے بارے میں اشاروں ہی اشاروں میں یوں باتیں کر رہے تھے جیسے میری کہانی کے ماحول سے نکل کر ہادی خود وہاں تشریف رکھتے ہوں۔ بہت پسند کی گئی تھی وہ کہانی۔ اور میرے جیسے نو وارد کے لیے یہ بڑی حوصلہ افزائی کی بات تھی لیکن اچھی کہانی لکھ لینا اور بات ہے اور ادبی محفلوں میں کچھ کہہ پانا اور بات۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے جب

سب لوگ کہانی کی تعریف کر چکے تو مجھ سے بھی کچھ کہنے کو کہا گیا، اب مجھے ادبی محفلوں میں بولنے کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ اس لیے کچھ ایسا بھی کہہ گیا جو کہانی میں نہیں تھا۔

''تب تو ہم بے کار ہی اس کہانی کی تعریف کرتے رہے۔''

میری بات سن کر باقر مہدی نے کہا تھا۔ اور میں آسمان کی فضاؤں میں اُڑتا اُڑتا واپس زمین پر آ گیا۔

لکھنؤ کے اس ادبی حلقے میں میرے رفیق تھے رام لعل۔ ڈاکٹر محمد حسن، مسیح الحسن رضوی، ڈاکٹر قمر رئیس، منظر سلیم، اقبال مجید، عابد سہیل، حسن عابد، احمد جمال پاشا، شارب رودولوی، آغا سہیل، شمیم نکہت، حسن کمال، سبط اختر، قیصر تمکین، بشیشر پردیپ اور نجم الحسن وغیرہ۔ اساتذہ میں تھے پروفیسر آل احمد سرور، احتشام حسین، علی عباس حسینی، رضیہ آپا، امرت لال ناگر، یش پال اور بھگوتی چرن ورما۔ ادبی جلسے زیادہ تر سرور صاحب اور احتشام صاحب کے ہاں ہوتے تھے۔ یا پھر سروپ کماری بخشی، یشپال جی اور رضیہ آپا کے ہاں۔ ہم سب کی ادبی کاوشوں کو جلا بخشنے میں ان جلسوں کی بڑی اہمیت ہے۔ کوئی ایک ادیب اپنی کہانی دس پندرہ منٹ میں پڑھ کر ختم کر دیتا۔ پھر اس پر بحث کا سلسلہ چلتا۔ اس کی اچھائیوں برائیوں کا تذکرہ ہوتا، ان جلسوں کے بعد ہم لوگ پہلے پہل نوری ہوٹل اور پھر سندر سنگھ کے ہاں بیٹھا کرتے تھے، اس کے بعد کافی ہاؤس میں، چائے کی پیالی کے ساتھ بھی جلسے میں پڑھی گئی تخلیق پر آگے بات چیت ہوتی اور یہ سلسلہ اس وقت تک چلتا جب تک ہفتہ پندرہ دن بعد دوسرا جلسہ نہ ہوتا، جہاں تک میرا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں میری ادبی شخصیت کی ساخت ان ہی جلسوں میں ہوئی تھی۔ میں تو پنجاب کے نہایت پچھڑے ہوئے گاؤں داؤد، تحصیل ناردوال ضلع سیال کوٹ کا ایک معمولی دیہاتی لڑکا تھا۔ ادبی جلسوں کے آداب تو کیا، میں تو شہری زندگی کے آداب سے بھی بالکل بے گانہ تھا۔

اس لیے میں اکثر اس ادبی حلقے کو ادبی مکتبے کے نام سے یاد کرتا ہوں، جہاں میں نے ادب کی الف، بے سیکھی، جہاں میں نے زندگی میں کچھ بننے کا پہلا قاعدہ پڑھا۔

مجھے ڈاکٹر محمد حسن کا وہ جملہ کبھی نہیں بھولتا کہ اگر کچھ نہیں لکھا ہے تو سمجھ لو خوراک کم ہو

رہی ہے۔ پڑھنا شروع کرو۔'' یہ جملہ آج بھی میرے لیے مشعل راہ بنا ہوا ہے۔

ایک اور یادگار واقعے کا ذکر کرنا چاہوں گا میں تب ناردن ریلوے کے حضرت گنج کے دفتر میں کام کرتا تھا۔ ایک دن وہاں دفتر میں بیٹھا ہوا تھا کہ کسی نے ہلکے سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو مجھے لگا جیسے ہمالیہ پہاڑ میرے پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا ہے وہ سجاد ظہیر تھے، کہہ رہے تھے۔

''چلو، باہر آؤ، تمہیں ملک راج آنند سے ملوانا ہے۔''

ملک راج آنند کا نام سنتے ہی پاؤں کے نیچے سے رہی سہی زمین کھسک گئی۔

دیکھا آپ نے! لکھنؤ نے اس دور میں اپنے ابھرتے ہوئے ادیبوں اور شاعروں کی کس طرح حوصلہ افزائی کی ہے۔ اور اسی کا نتیجہ ہے کہ پورے برصغیر میں ان سب کا نام روشن ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن، قمر رئیس اور شارب ردولوی کا شمار اہم نقادوں میں ہوتا ہے۔ رام لعل، آغا سہیل، اقبال مجید، عابد سہیل، قیصر تمکین اور بشیشر پردیپ کے ذکر کے بغیر اردو کے افسانوی ادب کی تاریخ مکمل نہیں ہوتی۔ حسن کمال بلٹز کے ایڈیٹر رہے اور فلموں کے کامیاب شاعر بنے۔ منظر سلیم کو روس میں رہ کر اردو کی خدمت کرنے کا موقع ملا ایسے درخشندہ ستاروں کے ساتھ رہ کر سیال کوٹ کے ایک گاؤں کا دیہاتی لڑکا جسے رتی کے نام سے پکارا جاتا تھا وہ اگر رتن سنگھ بن بھی گیا تو کسی کو اچنبھا نہیں ہونا چاہئے۔

یہ رتن سنگھ کسی کامیابی پر کبھی ہوا میں اڑا بھی ہے تو باقر مہدی کے الفاظ یاد آتے ہی یہ فوراً زمین پر اتر آیا ہے۔ اپنی پہلی کہانی اس نے بیوی کو سنائی تھی۔ آج بھی بیوی ہی اس کی کہانیوں کی پہلی قاری ہے اور اس کے چہرے پر ہونے والے تاثرات کی روشنی میں ہی اسے اپنی کہانی کی قدر و قیمت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ جو کہانی بیوی کو اچھی لگی ہے اسے نقادوں نے بھی سراہا ہے اور جسے سنتے سنتے وہ خراٹے بھرنے لگے۔ اس کی طرف کسی کا بھی دھیان نہیں جاتا۔

باقی کی کہانی تو بس اتنی ہی ہے کہ کہانی میں اس حد تک ایمان رکھتا ہوں کہ میرے نزدیک خدا سب سے بڑا کہانی کار ہے۔ اس کی تخلیق کردہ کائنات کے پس منظر میں اس کی

مخلوق، اس کے کردار ہیں، آتے جاتے موسموں میں شب و روز ہونے والے زندگی کے واقعات اس کی کہانی کو تسلسل بخش رہے ہیں۔ اور اس میں تحیر ایسا ہے کہ اپنے آپ کو اشرف المخلوقات کہنے والے انسان کو خدا کی قدرت کی ذرا سی رمز بھی سمجھ میں نہیں آئی۔ بس دیکھ رہا ہے اور حیران ہو رہا ہے۔

ایسے میں کیا رتن سنگھ اور کیا اس کی کہانیاں۔ ان کی حیثیت تو ہوا کہ دوش پر لکھے گئے حروف کی ہے اور جب ہوا کی تختی ہی کسی کو دکھائی نہیں دیتی تو اس پر لکھے ہوئے حروف کسی کو کیا دکھائی دیں گے۔ پھر بھی تمنا یہ ہے کہ ؎

جب تک ہے سانس باقی، باقی ہے زندگانی
لکھیں ہوا کے دوش پر، ہم نت نئی کہانی

○○○

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے
ہیں مزید اس طرح کی شان دار،
مفید اور نایاب کتب کے حصول کے لئے
ہمارے وٹس ایپ گروپ کو جوائن کریں

ایڈمن پینل

عبداللہ عتیق : 03478848884

سدرہ طاہر : 03340120123

حسنین سیالوی : 03056406067

اُردو اکادمی دہلی

کے چند اہم مونوگراف

شیخ ظہورالدین حاتم
مرتب: پرفیسر عبدالحق
قیمت: ۳۰ روپے، صفحات: ۱۲۰

میر ناصر علی دہلوی
مرتب: ڈاکٹر ارتضیٰ کریم
قیمت: ۳۰ روپے، صفحات: ۱۲۸

شاہ نجم الدین مبارک آبرو
مرتب: پروفیسر خالد محمود
قیمت: ۳۰ روپے، صفحات: ۱۲۸

خواجہ الطاف حسین حالی
مرتب: ڈاکٹر شہزاد انجم
قیمت: ۴۰ روپے، صفحات: ۱۵۶

مومن خاں مومن
مرتب: ڈاکٹر توقیر احمد خاں
قیمت: ۳۰ روپے، صفحات: ۱۲۰

قائم چاندپوری
مرتب: ڈاکٹر خالد علوی
قیمت: ۱۰۰ روپے، صفحات: ۲۶۴

مرزا محمد رفیع سودا
مرتب: ڈاکٹر مظہر احمد
قیمت: ۵۰ روپے، صفحات: ۱۸۴

میر اثر
مرتب: ڈاکٹر مولا بخش
قیمت: ۳۰ روپے، صفحات: ۱۱۲

دیوانِ غالب
(صدی ایڈیشن، اردو۔ ہندی)
مرتب: علی سردار جعفری
قیمت: ۳۰۰ روپے، صفحات: ۴۷۲

میر امّن
مرتب: پروفیسر ابن کنول
قیمت: ۴۰ روپے، صفحات: ۱۵۲

مرزا غالب (مکتوب نگاری)
مرتب: ڈاکٹر خالد اشرف
قیمت: ۳۰ روپے، صفحات: ۱۲۸

فائز دہلوی
مرتب: ڈاکٹر کوثر مظہری
قیمت: ۳۰ روپے، صفحات: ۱۲۸

انتخاب کلام
عابد پیشاوری
مرتب: ڈاکٹر جمیل اختر
قیمت: ۳۰ روپے، صفحات: ۱۱۲

مرزا غالب
(شخصیت اور شاعری)
مرتب: پروفیسر ابوالکلام قاسمی
قیمت: ۳۰ روپے، صفحات: ۱۲۸

خواجہ میر درد
مرتب: پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی
قیمت: ۳۰ روپے، صفحات: ۱۲۸

رابطہ: سی۔ پی۔ او۔ بلڈنگ، کشمیری گیٹ، دہلی Ph : 23863858, Fax : 23863773